غزوات اور سرایا میں مباحثِ فقہیہ: اصح السیر کا اختصاصی مطالعہ

(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

عبدالرحیم

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۲ء

غزوات اور سرایا میں مباحثِ فقہیہ: اصح السیر کا اختصاصی مطالعہ

مقالہ نگار

عبدالرحیم

ایم اے (جامعہ اشرفیہ لاہور)، پنجاب، ۲۰۱۷ء

یہ مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا ہے

ایم۔ فل علوم اسلامیہ

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

© عبدالرحیم، ۲۰۲۲

بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

منظوری فارم برائے مقالہ ودفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **غزوات اور سرایا میں مباحثِ فقہیہ: اصح السیر کا اختصاصی مطالعہ**

Jurisprudential Discussions in Ghazwat and Saraya: A Special Study of "Assahul-Siyyar"
Ghazwat aur Saraya mein Mubahis-e-Faqih: Assahul-Siyyar ka Ikhtisasi Mutala'a

نام ڈگری: **ایم فل علوم اسلامیہ**

نام مقالہ نگار: **عبدالرحیم**

رجسٹریشن نمبر: **1687 M Phil/IS/S19**

ڈاکٹر ارم سلطانہ
(نگران مقالہ) ________________ دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
(صدر شعبہ، علوم اسلامیہ) ________________ دستخط صدر شعبہ

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ________________ دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

بریگیڈیر سید نادر علی
(ڈائریکٹر جنرل) ________________ دستخط ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: ________________

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں عبدالرحیم والد عبدالرحمن

رول نمبر: MP-S19-506 رجسٹریشن نمبر: 1687 M Phil/IS/S19

طالب علم، ایم فل علومِ اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً" اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ

بعنوان: **غزوات اور سرایا میں مباحثِ فقہیہ: اصح السیر کا اختصاصی مطالعہ**

Jurisprudential Discussions in Ghazwat and Saraya: A Special Study of “Assahul-Siyyar”
Ghazwat aur Saraya mein Mubahis-e-Faqih: Assahul-Siyyar ka Ikhtisasi Mutala’a

ایم فل علومِ اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور **ڈاکٹر ارم سلطانہ** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے، اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: عبدالرحیم

دستخط مقالہ نگار: ____________________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

Jurisprudential Discussions in Ghazwat and Saraya: A Special Study of "Assahul-Siyyar"

Abstract

The second major source of Jurisprudence is Sira-e-Taiba. The inference of jurisprudential rules from Sira is known as Fiqh-us-Sira. Among the old historians, only Ghazwat and Sarai were included in the Sira. While the later ones have included in the Sira the acts of worship, morals and other aspects of the life of the Holy Prophet (PBUH).

There is a large collection of books written on the subject of Fiqh- us-Sira. However, in this research, a special study has been made of the jurisprudential discourses of Assahul-Siyyar by Maulana Abdul Rauf Dana Puri.He was born in Danapur in 1856, had a deep interest in knowledge. Since his father was a high-ranking religious scholar, he got a religious and scholarly environment from the very beginning. He devoted his entire life for educational services. Though, he wrote different books but the status of "Assahul-Siyyar "written on Sira-e-Taiba is higher than all his other writings. He passed away in 1948.

Therefore, in this thesis, the rules and issues of jurisprudence, war Injunctions and principles are discussed. So that with the study of Sira-e-Taiba, one can get acquainted with the rules and issues of jurisprudence and the rules and regulations of war, which is the main purpose of writing of this thesis.

This thesis consists of three chapters, findings, recommendations. Chapter No. 1 describes the background, author, style and method of the book and its characteristics in the light of the jurisprudential rulings of Ghazwat and Saraya. Chapter 2 deals with the general issues and rulings inferred from Ghazwat and Saraya. Chapter 3 describes the principles and rules of war derived from Ghazwat and Saraya and their use in modern times.

Key Words: *jurisprudential rules, Ghazwat and Sarai, scholarly environment, war Injunctions, principles*

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱.	مقالہ کی منظوری کا فارم (Thesis Acceptance Form)	iv
۲.	حلف نامہ (Declaration)	v
۳.	ملخص مقالہ (Abstract)	vi
۴.	فہرست عنوانات (Table of Contents)	vii
۵.	اظہار تشکر (Acknowledgements)	ix
۶.	انتساب (Dedication)	x
۷.	مقدمہ	xi
۸.	**باب اول: غزوات و سرایا کا فقہ السیرۃ کے پس منظر میں مطالعہ**	۱
۹.	فصلِ اول: فقہ السیرۃ کا تعارف اور تاریخی پس منظر	۲
۱۰.	فصلِ دوم: غزوات و سرایا کا تعارف	۱۱
۱۱.	فصلِ سوم: "اصح السیر" کا اسلوب و منہج اور خصوصیات	۵۳
۱۲.	**باب دوم: غزوات و سرایا میں پیش آمدہ عمومی مسائل اور احکام**	۷۳
۱۳.	فصلِ اول: شہداء کی تجہیز و تکفین کے مسائل	۷۵
۱۴.	فصلِ دوم: زکوٰۃ اور غنائم کے مسائل	۸۲
۱۵.	فصلِ سوم: متفرق مسائل	۹۸
۱۶.	**باب سوم: غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد اور عصرِ حاضر میں ان سے استفادہ**	۱۲۳
۱۷.	فصلِ اول: غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد	۱۲۴
۱۸.	فصلِ دوم: عصرِ حاضر میں ان جنگی اصول و قواعد سے استفادہ کی صورتیں	۱۴۴
۱۹.	**خلاصہ تحقیق**	۱۵۴

۲۰.	نتائج	۱۵۶
۲۱.	سفارشات	۱۵۷
۲۲.	فہرست آیات کریمہ	۱۵۸
۲۳.	فہرست احادیث مبارکہ	۱۵۹
۲۴.	مصادر و مراجع	۱۶۱

اظہار تشکر

الحمدللہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلاۃ والسلام علی اشرف الانبیاءوالمرسلین وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و اھلِ بیتہ وذریتہ اجمعین

تمام شکر اور تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔اللہ رب العزت جو تمام جہانوں کا رب ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے بغیر کسی تفریق و امتیاز کے۔ ہمارے سیاہ کاریوں کو نظر انداز کر کے اپنی شان کے مطابق نوازتا ہی چلا جاتا ہے۔وہی تمام شکر و حمد کا اصل حق دار ہے۔جو شکر گزار ہونے پر پہلے سے زیادہ نوازتا ہے اس کا شکر انسان تمام عمر بھی ادا کرتا رہے تو بھی اس کی نعمتوں کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی میں شکر گزار ہوں کہ اسی میں اس کی رضا ہے۔رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور اس کے حبیب ﷺ کا ذکر نا ہو تو شکر پورا ہی نہیں ہوتا۔وہی تو ہیں جنہوں نے ہمیں اللہ تعالیٰ سے متعارف کرایا اور ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بہترین انداز سکھایا۔اور میں شکر گزار ہوں حضور ﷺ کا امتی ہونے پر اور ان تمام رحمتوں پر جو صرف حضور ﷺ کی امت کے لئے نازل ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے بعد میرے والدین سب سے زیادہ حقدار ہیں اس بات کے کہ ان کا شکر ادا کیا جائے جو اس بھری دنیا میں میرا واحد حفاظتی حصار ہیں۔میری ذات سے بھی زیادہ میرے مخلص ہیں۔انہوں نے میرے لیے دنیا کے تمام علوم سے بہترین علم چنا اور مجھے موقع دیا کہ میں دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی سنوار سکوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دنیا آخرت پر سکون بنا دے۔ اس کے بعد بہت زیادہ شکر گزار ہوں میڈم ارم سلطانہ کا جنہوں نے یہ موضوع منتخب کرنے اور اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس اہم کام کو مکمل کرنے میں بڑی شفقت اور ذمہ داری سے میرا ساتھ دیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ استاد واقعی روحانی والدین کی طرح ہوتے ہیں اور والدین ہی کی طرح آپ کو بہترین بنانا چاہتے ہیں۔

میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ مجھے شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کے صدقے سے میری اس ادنیٰ سی کوشش کو شرفِ قبولیت اور میری کم علمی کی بنا پر اس میں پائی جانے والی تمام خامیوں پر در گزر فرمائے۔ آمین!

عبدالرحیم

انتساب

میں اپنی اس ادنیٰ سی تحقیقی و علمی کاوش کو اپنے والدین ، اساتذہ، شریک حیات اوران دوستوں کے نام کرتا ہوں جنہوں نے میری تعلیمی زندگی میں رہنمائی اور مدد فراہم کی اور جن کی دعائیں اور تربیت میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اور جن کی کوششوں کی بدولت آج میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔

مقدمہ

الحمدلله رب العالمين والصلاة والسلام علىٰ خير الخلائق محمد و آله واصحاب وازواجه وذرياته واهل بيته اجمعين.

تعارف موضوع (Introduction of the topic)

امابعد، کائنات میں جتنے علمی و عملی کام ہیں۔ ان میں سب سے مقدم اور سب سے ضروری کام یہ ہے کہ خود انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت کی جائے اور ان کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا جائے۔ اور اسی کام کے لئے اللہ ربّ العزت نے انسانیت کی تخلیق کرنے کے ساتھ ہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے اس کے اخلاق حسنہ کی تربیت کا اہتمام بھی کر دیا، جو کائنات میں سب سے ضروری اور مقدم کام تھا۔ اسی مقصد کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بابرکت ہوئی۔ فرمایا کہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾[۱]

ترجمہ: بے شک ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تعالی نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام بھیجے، لیکن جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی حفاظت کی گئی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل سیرت تو حدیث ہے، لیکن متقدمین کی اصطلاح میں فقط غزوات اور سرایا کے حالات و واقعات کے مجموعہ کو سیرت کہا جاتا ہے۔ حدیث آٹھ علوم کے مجموعہ کا نام ہے اور سیرت اس کا ایک جزو ہے۔ دوسرے علوم کی طرح سیرت نگاری بھی ایک فن ہے، جس کی تدوین کے لئے ہر دور میں مختلف پہلوؤں پر مختلف انداز سے کام کیا گیا۔ انہیں پہلوؤں میں سے ایک پہلو "فقہ السیرۃ" ہے۔ فقہ میں سیرت کو دوسرے بڑے مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور سیرت سے فقہی احکام و مسائل کا اخذ و استنباط ہی فقہ السیرۃ کہلاتا ہے۔ سیرت کے اس پہلو میں زندگی کے عملی پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن سیرت نگاری میں اس پہلو پر سب سے پہلے محمد بن عمر الواقدی[۲] نے کام کیا۔ یہ کام جاری رہا اور اس موضوع پر مستقل تصانیف لکھی جاتی رہیں۔ مثلاً ابن حزم (۴۵۶ھ) کی **"جوامع السیرۃ"**، امام

۱۔ الانبیاء:۲۱/۱۰۷

۲۔ الواقدی مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور اِن کی نسبت "الواقِدی" اپنے دادا "الواقد الاسلمی" کے نام سے ہے جو مدینہ منورہ میں بنو اسلم کے ایک گندم فروش عبد اللہ بن بریدہ کے غلام تھے۔ ابن سعد کے کہا ہے کہ الواقدی بنو اسلم کی ایک شاخ بنو سہم کے مولیٰ تھے۔ سنہ ۱۷۰ ہجری مطابق ۷۸۶ء میں جب عباسی خلیفہ ہارون الرشید حج کے لیے بغداد سے حجاز آئے تو الواقدی کا تعارف اُن سے ایک مستعد عالم کی حیثیت سے کروایا گیا۔ (خطیب بغدادی: تاریخ مدینۃ السلام المعروف بہ تاریخ بغداد، (الرقم الترجمہ ۱۲۰۳، طبع دار الغرب الاسلامی، بیروت لبنان، ۲۰۰۱ء)، ص:۴/۳۱)

سہیلی (۵۸۱ھ) کی **"الروض الانف"** اور ابن القیم کی **"زاد المعاد"** جس میں فقہ السیرۃ کے اسلوب کو باقاعدہ ایک فن کی صورت میں متعارف کرایا گیا۔

اسلام کے برصغیر میں داخل ہونے کے بعد یہاں دوسرے بہت سے اسلامی علوم کے ساتھ اس موضوع پر بھی خاطر خواہ کام ہوا۔ دور جدید میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں سے مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی **"اصح السیر"** قابل ذکر ہے۔ اس مقالہ میں اسی کتاب کے غزوات و سرایا کے ضمن میں بیان کردہ فقہی مباحث اور ان کے اسلوب کے مطالعہ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اصح السیر کا اسلوب خالصتاً فقہی ہے۔

اس مقالہ کے پہلے باب میں فقہ السیرۃ، غزوات اور سرایا کا تعارف بیان کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں کتاب و مؤلف کا تعارف، غزوات و سرایا کا تعارف اسلوب و منہج اور خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے، تاکہ موضوعِ مقالہ کو سمجھنے کے لئے آسانی ہو۔ دوسرے باب میں غزوات و سرایا کے ماتحت فقہی مباحث سے اخذ کردہ احکام و مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اور تیسرے باب میں غزوات اور سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد اور عصر حاضر میں ان سے استفادہ حاصل کرنے کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

موضوع کی ضرورت و اہمیت (Need & Importance of the topic)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ روزاوّل سے جاری فرمایا، اور آخر میں حضور اکرم ﷺ کے ذریعے اس مقصد کو پورا کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ اور آپ ﷺ نے انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت کا اہتمام اس انداز میں کیا کہ اس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ آج تک دنیا میں کسی شخصیت پر اتنی کتب نہیں لکھی گئیں جتنی رسول اللہ ﷺ پر لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ پہلے تو سیرت کے تحت صرف غزوات و سرایا کے حالات واقعات کو ہی سیرت کے طور پر لکھا جاتا تھا، لیکن زمانہ کے بدلنے کے ساتھ سیرت کا دائرہ کار بھی وسیع ہوتا گیا اور سیرت نگاروں نے حضور ﷺ کی عبادات و اخلاق و عادات، آپ ﷺ کے شمائل و خصائص، لباس و طعام اور زندگی کے دوسرے بہت سے پہلوؤں کو بھی سیرت میں شامل کر دیا۔ اس طرح فقہ السیرہ کا دائرہ بھی وسیع ہوا اور آپ ﷺ کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے انسانی زندگی کے مختلف ادوار میں پیش آنے والے مسائل کا استنباط کیا گیا۔

یہ حضور ﷺ کا معجزہ تھا کہ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے نمونہ بنا دیا گیا۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے متعلق سیرت میں کوئی مثال موجود نہ ہو۔ پھر ہمارے فقہاء و علماء نے حضور ﷺ کی تعلیمات کے مطابق قرآن سے زندگی کے اصول و قوانین نافذ کرکے سیرت کے واقعات سے ان کا عملی نمونہ لیا۔ اور پوری ذمہ داری کے ساتھ واقعات سیرت سے شرعی احکام کا استنباط کرکے انسانوں کے لیے آسانی اور حضور ﷺ کے انسانوں کو

ہدایت پہنچانے کے مشن میں اپنا کردار ادا کیا۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں پیش آنے والے ہر قسم کے مسائل جو زندگی کے کسی بھی پہلو سے تعلق رکھتے ہوں کا حل فقہی احکام کی صورت میں موجود ہے جو انسان کی ہر لحاظ سے رہنمائی کرتا ہے۔ ہمارے اسلاف نے اس سلسلہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور آج اس علم کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے اصحاب سیر کی طرف دور حاضر میں سیرت رسول ﷺ پر کئے جانے والے اعتراضات اور اسلام اور سیرت کے متعلق پیدا کیے جانے والے شکوک و شبہات کا منہ توڑ جواب دیا جارہا ہے۔ اور سیرت کو فقہ السیرۃ کے انداز میں پیش کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان نسل کو آپ ﷺ کی سیرت کے ساتھ فقہی مسائل سے بھی آگاہی حاصل ہو۔ مقالہ کے اس موضوع کے انتخاب کی وجہ بھی یہی ہے کہ سیرت کے عنوان پر کام کرکے سیرت سے حاصل ہونے والے علم کے سمندر سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

مقاصد تحقیق(Importance of the topic)

مقالہ کے مقاصد واہداف درج ذیل ہیں

اَ. اصح السیر کی فقہی مباحث کا تعارف کرانا۔

ب. فقہی مباحث کے بیان میں اختیار کردہ اسلوب و منہج کا جائزہ لینا۔

ت. فقہی مباحث سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد اور اصلاحات کا تعارف کرانا۔

ج. عصر حاضر میں ان سے استفادہ کی صورتوں کو بیان کرنا۔

تحقیق سے متعلق بنیادی سوالات(Research Questions)

اَ. فقہ السیرۃ میں اصح السیر کا اسلوب و منہج کیا ہے؟

ب. مولانا عبد الرؤف داناپوری نے سیرت کے واقعات یعنی غزوات و سرایا سے کون سے بنیادی مسائل مستنبط کیے ہیں؟

ت. غزوات و سرایا کی فقہی مباحث سے صاحب اصح السیر نے کون سے جنگی اصول و قواعد مستنبط کیے ہیں؟

تحدید موضوع(Limitation & Delimitations)

اس مقالہ میں مولانا داناپوری کی کتاب "اصح السیر" میں سے صرف غزوات و سرایا کے واقعات کے تحت بیان کردہ فقہی احکام و مسائل، جنگی اصول و قواعد اور ثمرات و نتائج کا احاطہ کیا گیا ہے۔

وجہ انتخاب(Selection of Reason)

عوام الناس موروثی روایات اور معمولی آگاہی کی بنیاد پر نبیٔ کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت اور تعظیم تو کرتے ہیں لیکن عملی دنیا سے ان کا تعلق کم دکھائی دیتا ہے۔ اس موضوع کو انتخاب کرنے کا مقصد سیرت کے اس نئے رجحان (فقہ السیرۃ) کو عوام الناس میں متعارف کرانا ہے تاکہ عوام الناس موروثی روایات سے نکل کر عملی دنیا میں آجائے۔

موضوع تحقیق پر سابقہ کام کا جائزہ(Literature Review)

مجوزہ عنوان کو منتخب کرنے سے پہلے اس موضوع سے متعلقہ سابقہ کام کا جائزہ لیا گیا تو درج ذیل تحقیقی کام سامنے آیا۔

مقالہ جات:

برائے پی ایچ ڈی

- سیرتِ مصطفیٰ ﷺ (مولانا ادریس کاندھلوی) اور ضیاء النبی ﷺ (پیر کرم شاہ الازہری) کے کلامی مباحث کا تحقیقی اور تقابلی مطالعہ، مقالہ نگار: محمد طیب عثمانی، نگران: مبشر حسن، اسلامیہ کالج، منڈی بہاء الدین، الحاق شدہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی (جی سی یو) لاہور، پنجاب پاکستان Gabriel، سیشن۔۲۰۱۴ء۔۲۰۱۶ء

اس مقالہ میں مقالہ نگار نے سیرتِ مصطفیٰ ﷺ اور ضیاء النبی ﷺ کے کلامی مباحث کے تقابل میں بہت اچھی کاوش کی ہے۔ دونوں سیرت نگاروں کی کلامی مباحث کو اس طرح آسان انداز میں بیان کیا ہے کہ باوجود ہر ایک کا بیان کا انداز مختلف ہونے کے ان مباحث کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اور اس میں امتیازیات اور خصوصیات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

برائے ایم فل

- اصح السیر اور سیرتِ النبی ﷺ کے مناہج سیرۃ کا تقابلی جائزہ، مقالہ نگار: ارشد سلیم، نگرانِ تحقیق: ڈاکٹر محمد ادریس لودھی، شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، پنجاب پاکستان، سیشن ۲۰۰۶ء۔۲۰۰۸ء

اس مقالہ میں مقالہ نگار نے اصح السیر اور سیرتِ النبی ﷺ کے مناہج سیرت کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے جو کہ ایم۔ فل درجہ کی ایک اچھی کاوش ہے۔

- سیرت مصطفی اور ضیاء النبی کے اسالیب کا تقابلی مطالعہ، مقالہ نگار: منیر احمد قاضی، نگران مقالہ: ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی، کلیہ عربیہ وعلوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان، سن تکمیل ۲۰۱۰ء

اس مقالہ میں سیرت مصطفی اور ضیاء النبی کے اسالیب، خصوصیات اور امتیازیات کا تقابلی جائزہ بہت اچھے انداز میں کیا گیا ہے۔

- اصح السیر اور الرحیق المختوم کا تحقیقی و تقابلی جائزہ، مقالہ نگار: نادیہ منیر، نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر مطلوب احمد، شعبہ علومِ اسلامیہ و عربی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، صوبہ پنجاب پاکستان، سیشن ۲۰۰۹ء۔۲۰۱۱ء

اصح السیر اور الرحیق المختوم کے تحقیقی و تقابلی جائزہ میں مقالہ نگار نے دونوں کتب کے اسلوب و منہج اور نتائج کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

- محمد ادریس کاندھلوی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت نگاری کے اسلوب و منہج کا تحقیقی اور تقابلی جائزہ، مقالہ نگار: الیاس حسین، نگران مقالہ: عبد الغفار، شعبہ علوم اسلامیہ (فاصلاتی نظام تعلیم) اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، صوبہ پنجاب پاکستان، سیشن ۲۰۱۱ء۔۲۰۱۳ء

اس مقالہ میں مقالہ نگار نے برصغیر میں بیان کیے گئے فقہ السیرۃ کے اسالیب پر روشنی ڈالی ہے اور خاص طور پر محمد ادریس کاندھلوی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت نگاری کے اسلوب و منہج کا تحقیقی اور تقابلی جائزہ لیا ہے جو کہ ایک اچھی کاوش ہے۔

- سیرت النبی ﷺ (مولانا شبلی نعمانی اور سید سلمان ندوی) اور اصح السیر کے کلامی مباحث کا تحقیقی و تقابلی مطالعہ، مقالہ نگار: ہدایت علی رانا، نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر شبیر احمد عثمانی، ادارہ علومِ اسلامیہ

اس مقالہ میں سیرت النبی ﷺ (مولانا شبلی نعمانی اور سید سلمان ندوی) اور اصح السیر کے کلامی مباحث کا بہت اچھے انداز میں تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں دونوں کتابوں کے مصنفین اور کتابوں کے تعارف کو بھی اچھے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

- رحمۃ اللعالمین، اصح السیر اور سیرت مصطفیٰ کا منہج۔ تقابلی و تجزیاتی مطالعہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ، مقالہ نگار: بشریٰ جبیں، نگران مقالہ: ڈاکٹر ساجد اقبال، یونیورسٹی آف سرگودھا، سیشن، ۲۰۱۴ء-۲۰۱۶ء

اس مقالہ میں مقالہ نگار نے "رحمۃ اللعالمین" اور "سیرت مصطفیٰ" کے اسلوب و منہج، خصوصیات اور امتیازیات کو تو بیان کیا ہے مگر اس میں مجھے اصح السیر کے حوالہ سے کوئی خاص کام نہیں ملا۔

آرٹیکلز:

- برصغیر کی سیرت نگاری میں فقہ السیرہ کا اسلوب (ایک تجزیاتی مطالعہ)، ڈاکٹر حافظ محمد نعیم
- سیرت حلبیہ میں فقہ السیرۃ کے اسلوب کا مطالعہ، ڈاکٹر حافظ محمد نعیم
- بیسویں صدی میں فقہ السیرہ کا رجحان، ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی
- بیسوی صدی میں اردو سیرت نگاری کے مناہج و اسالیب، سید عزیز الرحمٰن
- شمائل و خصائلِ نبوی ﷺ (ہندوؤں اور سکھوں کے ادب و سیرت کا مطالعہ) حافظ محمد نعیم
- معاہدہ حدیبیہ فقہی مطالعہ، ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی
- غزوہ بدر: فقہ و دلالات، الدکتور عصمت اللہ زاہد
- اعتقادی اور تعبدی امور میں شدت پسندی کا رجحان (فقہ السیرۃ کے تناظر میں) ڈاکٹر حافظ محمد نعیم
- وقائع سیرت سے استنباط احکام میں مباحثِ اصولیہ کا اطلاق، ڈاکٹر حافظ محمد نعیم
- "فقہ السیرۃ" کی اہمیت اور غزوۂ خیبر سے متعلق فقہیات سیرت کا استخراج، ڈاکٹر محمد انیس خان

کتب:

- فقہ السیرۃ، ڈاکٹر محمد الغزالی
- سیرت مصطفی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی
- بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی
- فقہ السیرۃ النبویہ، ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی
- مدارج النبوۃ، حضرت شیخ محقق، علامہ شیخ محمد عبد الحق محدث دہلوی
- محاضرات سیرت، ڈاکٹر محمود احمد غازی

ان مقالہ جات اورآرٹیکلز میں بر صغیر کے اندر سیرت کی کتب پر مختلف مباحث، اسلوب (فقیہانہ اسلوب، محدثانہ اسلوب، کلامی اسلوب، درایتی اسلوب اور تحقیقی و تجزیاتی اسلوب) اور آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ، صداقت کا اظہار، ہندوؤں کی کتب میں آپ ﷺ کے متعلق بشارتیں اور حضور ﷺ کی ذات کے متعلق مختلف من گھڑت کہانیوں کی تردید وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، لیکن میں اپنے اس مقالہ کے اندر مولانا حکیم عبدالرؤف داناپوری کی کتاب "اصح السیر" میں خاص طور پر غزوات و سرایا کے ضمن میں پیش آنے والے فقہی احکام و مسائل میں فقہاء کی آراء اور حکیم عبدالرؤف داناپوری کی رائے کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد و اصلاحات کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ میری معلومات کے مطابق اس مضمون پر ایم فل کے درجہ کا کام ابھی تک نہیں ہوا۔

اسلوب تحقیق (Research Method & Methodology)

- مقالہ کا انداز تعارفی اور توضیحی ہے۔
- مواد کے حصول کے لیے مذکورہ بالا کتاب اور دیگر کتب کی مراجعت کی گئی ہے۔
- مقالہ کی تقسیم میں تین ابواب ہیں اور ہر باب کے لئے الگ الگ عنوان تیار کیا گیا ہے۔ ان ابواب کو فصول اور مباحث میں تقسیم کیا گیا ہے۔
- اس مقالہ کو نمل کے فارمیٹ کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب اول

غزوات و سرایا کا فقہ السیرۃ کے پس منظر میں مطالعہ

فصلِ اول: فقہ السیرۃ کا تعارف اور تاریخی پس منظر

فصلِ دوم: غزوات و سرایا کا تعارف

فصلِ سوم: "اصح السیر" کا اسلوب و منہج اور خصوصیات

فصل اول

فقہ السیرۃ کا تعارف اور تاریخی پس منظر

ا۔ فقہ السیرۃ کا تعارف

فقہ السیرۃ کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ کو دو طرح سے بیان کیا جارہا ہے۔ایک تعریف جزوی لحاظ سے ہے اور دوسری قلبی لحاظ سے ہے۔

فقہ کا لغوی معنیٰ:

فقہ کا لغوی معنیٰ کسی شے کا جاننا اور اس کی معرفت و فہم حاصل کرنا ہے۔

"الفِقْهُ: العلم بالشيء والفهمُ له وغلبَ على عِلْم الدين لسِيادَتِه وشرفه وفَضْلِه على سائر أَنواع العلم"[1]

ترجمہ:"فقہ کسی چیز کا علم اور اس کو سمجھنے کا نام ہے۔اور اس کو علمِ دین کی سمجھ پر غالب کیا ہے کیونکہ علمِ دین کو تمام علوم پر فضیلت حاصل ہے"۔

اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيَتفقَّهوا فِي الدِّينِ﴾[2]

ترجمہ:"تاکہ وہ دین کو سمجھیں"۔

حدیث نبوی میں بھی فقہ کا لفظ سمجھ بوجھ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

((وَمَنْ يُرِدْ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ))[3]

ترجمہ:"اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتے ہیں اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتے ہیں"۔

"أَي لِيَكونوا عُلَماءَ بِه، وفَقَّهَه اللهُ"[4]

ترجمہ:"یعنی اس کا علم حاصل کریں،اور خدا انہیں سمجھ عطا فرمائے"۔

۱۔ ابن منظور، محمد بن مکرم افریقی، لسان العرب، (مکتبہ دار صادر، بیروت، لبنان، طبع اولی، ۱۴۱۴ھ) ص:۱۳/ ۵۲۲

۲۔ التوبہ:۹/ ۱۲۲

۳۔ مسلم، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب النہی عن المسألۃ، ۲/ ۷۱۸، ح:۱۰۳۷

۴۔ ابن منظور، لسان العرب، ص:۱۳/ ۵۲۲

سیرت کا لغوی معنیٰ:

لفظ ''سِیرۃ'' دراصل "سَارَ یَسِیْرُ سَیْرًا وَ مَسِیْرًا" سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں: "طریقہ، چال چلن"[1] سیرت کے معنیٰ طریقہ اور برتاؤ کے ہیں اور سیرت کا لفظ سوانح حیات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ﴾[2]

ترجمہ: "فرمایا بے خوف ہو کر اسے پکڑ لیں، ہم اسے اسی پہلی سی صورت میں دوبارہ لٹادیں گے"۔

اردو زبان میں لفظ سیرت کا استعمال عام طور پر انسان کے چال چلن اور عادات واطوار کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ لیکن لغت کے ماہرین نے اس کے معنیٰ الگ الگ بیان کیے ہیں۔ قاموس الوحید کے مطابق سیرت کے معنیٰ طریقہ، راستہ، روش اور شکل وصورت کے ہیں۔

اسی طرح اللہ کے حبیب ﷺ کی غزوات والی زندگی بھی اسی میں شامل ہے۔ محدثین اور فقہاء نے بھی آپ ﷺ کے غزوات کو اسی عنوان (السیرۃ) کے تحت ذکر کیا ہے۔

سیرت کا اصطلاحی معنیٰ:

اصطلاحی اعتبار سے سیرت کے یہ تمام معنیٰ اور مفہوم صرف پیغمبرِ خدا حضرت محمد ﷺ کے لیے مخصوص اور محدود ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے۔ محدثین اور اربابِ رجال کی اصطلاحِ قدیم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے، چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں، اور سیرت بھی۔ حافظ ابن حجر اپنی کتاب فتح الباری کی کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فقہ میں بھی یہی اصطلاح رائج ہے، اِس میں جو باب کتاب الجہاد والسیر کے لیے باندھا جاتا ہے۔ اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔"[3]

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے لکھا ہے کہ:

۱۔ غلام سرور لاہوری، جامع اللغات، (مکتبہ، منشی نول کشور، لکھنؤ، طبع اولی، ۱۸۹۰ء) ص: ۳/۴۵۴

۲۔ طٰہٰ: ۲۰/۲۱

۳۔ نعمانی، علامہ شبلی، سیرت النبی، (مکتبہ مدینہ لاہور، طبع اولیٰ، ۱۴۰۸ھ) ص: ۱/۲۲

"اصل سیرت تو سارا ذخیرۂ احادیث ہے، لیکن متقدمین کی اصطلاح میں فقط غزوات و سرایا کے حالات و واقعات کے مجموعے کو سیرت کہتے ہیں۔"[1]

حدیث آٹھ علوم کے مجموعے کا نام ہے اور سیرت اس کا ایک جز ہے۔

شاہ عبد العزیز کہتے ہیں:

"جو کچھ ہمارے پیغمبر اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت اور ان کے وجود سے متعلق ہو، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے وفات تک کے واقعات بیان کیے گئے ہوں وہ سیرت ہے۔"[2]

اس تعریف میں سیرت کے لفظ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھا کر صحابہ تک وسیع کر دیا گیا ہے۔

فقہ السیرۃ کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاحاً فقہ السیرۃ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے واقعات کے بارے میں جتنی روایات و اخبار اہل سیر نے استنادی حیثیت سے نقل کی ہیں، ان روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے سیرت کے کسی بھی واقعہ سے اس کے اصل مقصود تک رسائی حاصل کرنا فقہ السیرۃ کہلاتا ہے، پھر چاہے اس مقصد تک رسائی کسی نکتہ کی صورت میں ہو یا پھر کسی شرعی مسئلہ کے استنباط سے ہو یا اس واقعہ سے کوئی عمدہ نتیجہ اخذ ہوتا ہو یہ سب فقہ السیرہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔[3]

ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کے مطابق:

"واقعاتِ سیرت سے دروس و نصائح کا استنباط کرنا اور موجودہ حالات میں ان سے راہنمائی حاصل کرنا فقہ السیرۃ کہلاتا ہے۔"[4]

مولانا عبد المالک مجاہد لکھتے ہیں:

"سیرت نگاری کے مختلف اسالیب میں ایک اسلوب وہ ہے جس میں واقعاتِ سیرت کا احاطہ تو کیا ہی جاتا ہے، اس کے ساتھ واقعاتِ سیرت پر تدبر کرنے کے بعد جو اہم نکات اور احکام و مسائل معلوم ہوتے ہیں، سیرت نگاری کے اس منفرد اسلوب میں ان اہم نکات کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اصطلاح میں سیرت کے ایسے طرزِ نگارش کو فقۂ سیرت نگاری کہا جاتا ہے۔"[5]

شریعت اسلامی کے ہر پہلو کا گہرا فہم ادراک اور بصیرت کا نام فقہ ہے۔ اب جہاں تک فقہ السیرۃ کی اصطلاح کا

۱۔ کاندھلوی، مولانا محمد ادریس، سیرت مصطفی، (مکتبہ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۹ء) ص:۱/۳

۲۔ دہلوی، شاہ عبد العزیز، عجالۂ نافعہ، (مکتبہ، مصطفائی، کان پور، انڈیا، طبع اولی، ۱۲۵۵ھ، ۱۸۳۹ء) ص:۱۴

۳۔ حافظ محمد نعیم، جہات الاسلام، (جنوری-جون ۲۰۱۲) ج:۹، شمارہ:۲، ص ۱۲۴

۴۔ البوطی، ڈاکٹر محمد سعید رمضان، فقہ السیرۃ النبویہ، (مکتبہ دار الفکر المعاصر، البیروت، لبنان، طبع اولی، ۲۰۰۱ء) ص:۱۳

۵۔ صلابی، علی محمد، سیرت النبی، مترجمین مولانا محمد یونس بٹ، (الریاض، مکتبہ دار السلام، ۱۴۳۳ھ) ص:۲۹

تعلق ہے تو مختلف سیرت نگاروں نے فقہ السیرۃ کی توضیح و تشریح اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ لیکن ان تمام کے ہاں اصطلاحاً فقہ السیرۃ بالکل یکساں ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں۔

آپ ﷺ کی ایک دعا یہ ہے جو آپ ﷺ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے لیے فرمائی:

((اللَّهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ، وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ))(۱)

ترجمہ: "یعنی اے اللہ ابنِ عباس کو دین کا پختہ فہم اور ادراک نصیب فرما"۔

یعنی فقہ السیرۃ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے بحث کرنے والے علم کا گہرا فہم اور ادراک، اس لیے کہ فقہ کے لفظی معنیٰ ہیں کہ کسی چیز کا پختہ علم اور گہری بصیرت کا ہونا۔ اور اس کا اصل اطلاق بطورِ اصطلاح قرآن و سنت سے استنباط کردہ احکام و مسائل کے ایسے مجموعے پر ہوتا ہے جو امت کے لیے قانونی مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم فقہ اپنے عام معنی کے اعتبار سے بھی قرآن و سنت اور شریعتِ اسلامی کے فہم کو شامل ہے۔

سیر کی تعریف:

سیرت طیبہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے مختلف نوعیت کا کام مغازی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس لیے متقدمین کے ہاں سیر و مغازی ہی سیرت کا بنیادی نکتہ تھے۔

فقہ السیرۃ اور مباحثِ فقہیہ میں فرق:

الفقه:

هو العلم بالأحكام الشرعية الفرعية العملية والتوصل إليها من أدلتها التفصيلية، ويعتمد العلماء به على أربعة مصادر لاستنباط الأحكام وهي: القرآن، والسنة، والإجماع، والقياس.(۲)

ترجمہ: "فقہ احکام شرعیہ، فرعیہ، عملیہ کا وہ علم ہے جس کو حاصل کیا جاتا ہے تفصیلی دلائل کے ذریعے سے۔ اور بالاتفاق علماء احکام کا استنباط ان چار مصادر سے کرتے ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس"۔

فقه السيرة:

هو فقه يتناول السيرة النبوية للنبي صلى الله عليه وسلم لأخذ الدروس و العبر منها ، و تطرقها لبعض الأحكام الفقهية .(۳)

۱۔ ابو عبد اللہ، احمد بن محمد بن حنبل، مسند احمد بن حنبل، (مؤسسہ الرسالہ، طبع اولی، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۱ء) باب: وَمِنْ مُسْنَدِ بَنِي هَاشِمٍ، حدیث: ۳۰۳۲، (صحیح)

۲۔ زحیلی، وہبہ الزحیلی، الوجیز في أصول الفقه الإسلامي، (مکتبۃ: البیروت، مصر) ص: ۳۰

۳۔ ایضاً

ترجمہ: "یہ ایک فقہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے متعلق ہے، تاکہ اس سے دروس وعبر حاصل کیے جاسکیں، اور اس میں بعض فقہی احکام پر روشنی ڈالی جاتی ہے"۔

ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباحث فقہیہ اور فقہ السیرۃ میں دو طرح کا فرق ہے۔ ایک یہ کہ مباحث فقہیہ کے ماخذ (قرآن، سنت، اجماع اور قیاس) ہیں۔ اور فقہ السیرۃ کا ماخذ صرف "سیرت طیبہ" ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مباحث فقہیہ میں صرف فقہی احکام ذکر کیے جاتے ہیں جبکہ فقہ السیرۃ میں دروس، عبر و نصائح اور فقہی احکام بھی ذکر کیے جاتے ہیں۔

فقہ السیرۃ کی توضیح:

شریعت اسلامی کے ہر پہلو کا گہرا فہم و ادراک اور بصیرت کا نام فقہ ہے۔ اور بہت سے اسلامی علوم و فنون ایسے ہیں جن کے ساتھ فقہ کا لفظ جیسے فقہ الحدیث، فقہ القرآن اور فقہ اللغہ وغیرہ۔ "فقہ السیرۃ" بھی اسی قبیل سے مفہوم شدہ ہے۔

فقہ السیرۃ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے واقعات اور احوال و آثار سے تعلق رکھنے والے علوم و فنون کا گہرا فہم و ادراک حاصل کرنا ہے۔ اور فقہ السیرۃ کا تعلق سیرت طیبہ کے ہر اس پہلو سے ہے جس سے سیرت کی حفاظت ہوتی ہے۔ جس طرح وضع حدیث کے فتنے کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے محدثین نے روایت و درایت کے کڑے اصولوں کی روشنی میں اصول حدیث کو اس درجہ منضبط و مستحکم کر دیا ہے کہ اب کسی جھوٹے شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں کسی ایک جملہ یا لفظ کے بھی تحریف کر سکے۔ اس طرز پر سیرت پر کام نہیں ہوا ہے، جس کے باعث واقعات سیرت میں بعض واقعات سنداً یا درایتاً کمزور اور عظمت رسالت کے شایان شان نہیں، لیکن اب فقہ السیرۃ کے نام سے ابھرنے والے اس رجحان نے اصول سیرت کو مرتب کرنے اور واقعات سیرت کا جائزہ لینے کے سلسلے میں بڑی مدد کی ہے۔ اور ایسے واقعات جو کہ سیرت میں قابل اعتماد نہیں ان کی خوب تحقیق اور تنقیح کی ہے۔ (1)

فقہ السیرۃ دراصل اصول سیرت کا نام ہے جس سے سیرت کے ہر اس پہلو کی حفاظت ہوتی ہے جس کا تعلق فن سیرت سے ہو، اب یہ حفاظت روایات کی تحقیق و تنقیح یا چھان بین کی صورت میں ہو یا مستشرقین یا ملحدین کے اعتراضات کے جواب دینے کی صورت میں ہو یا سیرت کے واقعات میں نظر آنے والے تعارض کی تطبیق کی صورت میں ہو یا وقائع سیرت کے ضمن میں پائے جانے والی فقہی مباحث سے اخذ کردہ احکام و مسائل کی صورت میں، یہ سب "فقہ السیرۃ" کے

۱۔ ہاشمی، شاہ معین الدین، فکر و نظر، ج:۴۹، شمارہ:۲-۳، ص:۱۱۲-۱۱۳

مفہوم میں داخل ہیں۔ گویا کہ "فقہ السیرۃ" دراصل "فہم السیرۃ" کا نام ہے۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ فقہ السیرۃ کی اصطلاح سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کے متعلق ہو جاتی ہے۔ سیرت کے ادبی و اجتماعی پہلوؤں کا فہم بھی فقہ السیرۃ کہلاتا ہے، کلامیاتِ سیرت کی تحقیق بھی اس میں شامل ہے اور اس کا تعلق فقہیاتِ سیرت سے بھی ہو سکتا ہے۔ متقدمین کی سیرت نگاری میں ان تمام گوشوں سے بحث کی گئی ہے، بلکہ بعض کتب میں ان کی سب جوانب (یعنی قبل از بعثت و رسالت مکی دور، بعد از نبوت و رسالت مکی دور اور بعد از نبوت و رسالت مدنی دور) سے جامع طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جن میں ابنِ ہشام، ابنِ کثیر اور طبری کی کتب سیرت بہت نمایاں ہیں۔ فقہ السیرۃ کا ایک اسلوب وہ ہے جس میں سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں سے شرعی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے، ان میں سے زیادہ احکام مدنی دور سے اخذ کیے گئے ہیں اور پھر مدنی دور میں جن امور سے سب سے زیادہ احکام کا استنباط کیا گیا ہے ان میں معاملات، معاہدات، غزوات و سرایا اور مکاتیب و خطوط وغیرہ سرفہرست ہیں۔

۲۔ فقہ السیرۃ کا تاریخی پس منظر

عصر حاضر میں فقہ السیرۃ کا جو نیا رجحان امت کے سامنے آیا ہے اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ بیسویں صدی سے قبل کے سیرت نگاروں نے اس مفہوم کے مطابق کام نہیں کیا، بلکہ ان کتابوں میں فقہ السیرۃ کے حوالے سے بے شمار ذخیرہ موجود ہے۔ فقہ السیرۃ کے انداز میں سیرت نگاری کا یہ کام سب سے پہلے جس سیرت نگار نے کیا ہے وہ محمد بن عمر الواقدی ہیں۔ علامہ واقدی کے کام میں غزوات و سیر کے فقہی و قانونی پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے ہاں واقعاتِ سیرت کو تاریخی اعتبار سے بیان کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جس سے بہت سارے احکام کے بارے میں تدریج کی معرفت اور ناسخ و منسوخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ فقہی پہلو سے سیرت نگاری کی ایک خاص شکل و منہج "الجامع الصحیح" میں بھی موجود ہے۔ جس میں امام بخاری واقعاتِ سیرت پر مبنی روایات پر تراجم و تعلیقات اور ان سے احکام و مسائل کے استنباط کا اہتمام کرتے ہیں۔[2]

اگرچہ متقدمین و متاخرین کی امہات کتب میں باقاعدہ طور پر "فقہ السیرۃ" کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی مگر اس کے باوجود واقعاتِ سیرت کے ضمن میں اخذ شدہ احکام کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کتب میں بھی موجود ہے جو عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکمرانی سمیت زندگی کے تمام پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں "فقہ السیرۃ" کے لفظ کو باقاعدہ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

اگر بیسویں صدی سے پہلے کی کتب سیرت کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ان میں بھی واقعات سیرت کے فقہی

۱۔ حافظ محمد نعیم، جہات الاسلام، ص:۱۱۰

۲۔ ہاشمی، شاہ معین الدین، فکر و نظر، ص:۱۱۳

احکام و مسائل اور درس و عبر کا استنباط موجود تھا۔ جیسا کہ ابن حزم ظاہری (۴۵۶ھ) کی "**جوامع السیر**"[1]، ابن عبد البر (۴۶۳ھ) کی "**الدرر فی اختصار المغازی والسیر**"[2] امام سہیلی کی (۵۸۱ھ) کی "**الروض الانف**"[3] اور علامہ ابن قیم (۷۵۱ھ) کی "**زاد المعاد فی ھدی خیر العباد**"[4] علامہ ابن کثیر (۷۷۴ھ) کی "**السیرۃ النبویۃ**"[5] اس موضوع پر قابل ذکر تصانیف ہیں۔ ان کتابوں میں مفصل انداز میں واقعات سیرت سے فقہیات کو اخذ کیا گیا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ موجودہ دور کی کتب فقہ السیرۃ کا مصدر و منبع دراصل یہی کتب ہیں، لیکن اس دور میں اہل سیر کے ہاں فقہیات سیرت کی اصطلاح کا رواج نہیں تھا۔[6]

موجودہ دور میں "فقہ السیرۃ" کے طور پر کئی ایک کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں سے "فقہ السیرۃ النبویۃ" از سعید

۱۔ یہ سیرت نبوی پر ایک مختصر کتاب ہے جس کی درجہ بندی امام ابن حزم نے کی ہے، اس کی درجہ بندی کا مقصد ایک مختصر، آسان، قابل رسائی کتاب اپنے طلباء کے ہاتھ میں دینا تھا، جیسا کہ انہوں نے کہا۔ اپنے بہت سے تاریخی پیغامات، جیسے پیغام "دلہن کے نکات" اور اس کے خطوط میں۔ اور یہ کہ اس اختصار میں انہوں نے یہ اصول پیش کیے کہ علم کے طالب علموں میں سے سیرت نبوی پر کام کرنے والوں کو یاد دلانا یا حفظ کرانا ہے۔ (ابن حزم کا پورا نام علی بن احمد بن سعید بن حزم، کنیت ابو محمدؒ ہے اور ابن حزم کے نام سے شہرت پائی۔ آپ اندلس کے شہر قرطبہ میں پیدا ہونے اور عمر کی ۷۲ بہاریں دیکھ کر ۴۵۲ ہجری میں فوت ہویے۔ ابن حزم تقریباً چار صد کتب کے مولف کہلاتے ہیں۔)

۲۔ الدرر فی قصر المغازی اور السیر ایک کتاب ہے جسے یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمری القرطبی الاندلسی المالکی نے لکھا ہے۔ یہ پیغمبر محمد ﷺ کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کی سوانح حیات سے متعلق ہے، اور ان کی خبروں، ان کی جنگوں اور بہت کچھ سے بھی متعلق ہے۔ (ابن عبد البر القرطبی (پیدائش: ۲۹ نومبر ۹۷۸ء—وفات: ۴ فروری ۱۰۷۱ء) حدیث اور فقہ کے امام و مجتہد جنھوں نے اپنے عہد کے اکابر اساتذہ سے حدیث سنی اور احادیث کے حفظ و ضبط کے حوالے سے 'حافظِ مغرب' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کئی علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں۔)

۳۔ الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویہ سیرت ابن ہشام کی شرح الامام ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد اللہ السہیلی نے کی۔ اس کتاب کے مصنف نابینا تھے الروض الانف کو دار النشر: دار الکتب الاسلامیہ والوں نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا جو ۷ جلدوں میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ شرح سیرت ابن ہشام کے نام سے ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ نے کیا جسے ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور والوں نے شائع کیا یہ ۴ جلدوں پر مشتمل ہے یہ کتاب مشکل الفاظ کی شرح، حل طلب مقامات کی وضاحت اور پیچیدہ باتوں کی تسہیل کے لیے لکھی گئی۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب چار سو کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

۴۔ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد حافظ محمد ابن قیم الجوزی کی سیرت کے موضوع پر مشہور کتاب ہے۔ کتب سیرت میں زاد المعاد کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف حالات اور واقعات کے بیان پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ ہر موقع پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرت کے فلاں قول اور فلاں عمل سے کیا حکم مستنبط ہو سکتا ہے۔ (علامہ ابن قیم کا پورا نام حافظ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد بن حریز الزرعی الدمشقی تھا اور ابن قیم کے نام سے مشہور ہوئے، چھ سو اکیانوے (۶۹۱) ھ میں دمشق کے قریب زرع نامی گاؤں میں ولادت ہوئی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اور آپ کا تعلق امام احمد بن حنبل کی فقہ سے تھا۔)

۵۔ ابن کثیر عالم اسلام کے معروف محدث، مفسر، فقیہ اور مورخ گزرے ہیں۔ آپ کا مکمل نام اسماعیل بن عمر بن کثیر، لقب عماد الدین اور عرفیت ابن کثیر ہے۔ آپ ایک معزز اور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شیخ ابو حفص شہاب الدین عمر اپنی بستی کے خطیب تھے اور بڑے بھائی شیخ عبد الوہاب ایک ممتاز عالم اور فقیہہ تھے۔ حافظ ابن کثیر کی ولادت ۷۰۱ھ میں مجدل میں ہوئی جو بصریٰ کے اطراف میں ایک قریہ ہے۔ ابن کثیر مکی سے مغالطہ نہ کھائیں۔

۶۔ حافظ محمد نعیم، جہات الاسلام، ص:۱۲۵

رمضان البوطی[۱]، "فقہ السیرۃ" از منیر محمد عضبان[۲]، "فقہ السیرۃ" از محمد الغزالی[۳] مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار ایسی کتب ہیں جن میں سے بعض خصوصی انداز میں اور بعض عمومی طور پر "فقہ السیرۃ" کے طرز پر لکھی گئی ہیں۔

برصغیر کی کتب سیرت میں فقہ السیرۃ کا اسلوب:

اگر برصغیر کی سیرت نگاری پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائی نقوش سیرت سے سیرت نگاری کے زمانۂ عروج تک مختلف اسباب و محرکات کے پیش نظر سیرت نگاری میں بہت سے اسالیب و مناہج ملتے ہیں جنہیں مؤلفانہ، مؤرخانہ، محدثانہ، متکلمانہ اور فقیہانہ اسالیب کے تحت تقسیم کیا جاتا ہے۔

سیرت نگاری کے ان مختلف مناہج میں سے آخر میں ذکر کیا جانے والا اسلوب (فقیہانہ اسلوب) سیرت نگاری کا ایک ایسا اسلوب ہے جس میں وقائع سیرت میں پنہاں فقہی احکام، بصائر و حکم، اور دروس و عبر وغیرہ کا استخراج کیا جاتا ہے زمانۂ جدید میں مطالعہ سیرت کے اس انداز کو فقہ السیرۃ کا نام دیا گیا ہے۔[۴]

وقائع سیرت سے استنباط و عبر کے حوالے سے برصغیر کے مختلف ادوار کے تمام زبانوں میں لکھے گئے سیرتی ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو چند کتب ایسی ملتی ہیں جن میں فقہ السیرۃ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ان کتب میں حضور نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو باقاعدہ تاریخی تفصیلات کے ساتھ پہلو بہ پہلو واقعات سیرت سے استنباط کے درج ذیل اسالیب سامنے آتے ہیں۔

- واقعات سیرت سے دروس و عبر، بصائر و نصائح اور مصالح و حکم کا استنباط
- واقعات سیرت سے خالصتاً فقہی احکام کا اخذ و استنباط
- غزوات، معاہدات، مکتوبات سے فقہی، قانونی، عسکری و تنظیمی اور بین الاقوامی اصول و قوانین اخذ کیے گئے ہیں۔[۵]

۱۔ البوطی، محمد سعید رمضان (۱۳۴۷-۱۴۳۴ھ / ۱۹۲۹-۲۱ مارچ ۲۰۱۳ء) ایک شامی اسکالر تھے جو اسلامی علوم میں مہارت رکھتے تھے اور اسلامی دنیا کے اہم ترین مذہبی شخصیات میں سے ایک تھے۔ جسے دبئی انٹرنیشنل پرائز "دی ہولی قرآن" نے ۲۰۰۴ میں اپنے آٹھویں اجلاس میں "اسلامی دنیا کی شخصیت" کے طور پر منتخب کیا، "ایک ایسی شخصیت جس نے علماء کی تحقیقات اور میڈیا کی شہرت کو اکٹھا کیا۔

۲۔ ڈاکٹر منیر عضبان ۱۹۴۲ء میں تال دمشق کے علاقے میں پیدا ہوئے ۱۱ /۳ /۲۰۱۳ میں مکہ میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کر گئے انہوں نے ۱۹۶۷ میں دمشق یونیورسٹی سے شریعۃ کی ڈگری کی اور اسی یونیورسٹی سے تعلیم ایجوکیشن میں ڈپلومہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سیرت نبوی میں بڑی مہارت رکھنے والے پروفیسر منیر کو ۲۰۰۰ میں "السیرۃ النبیاء" میں تحقیق پر کنگ آف برونائی کا ایوارڈ ملا۔

۳۔ شیخ محمد الغزالی سقا (۱۹۱۷ء-۱۹۹۶ء) ایک مسلمان امام اور عالم تھے جن کی تصانیف نے مصر کی نسلوں کو متاثر کیا۔ ۹۴ کتب کے مصنف تھے۔ پچھلے ایک عشرہ میں مصر میں ان کی تجدید ایمان اسلام کوششوں کے باعث آپ بہت سراہے گئے ہیں۔

۴۔ غازی، محمود احمد، محاضرات سیرت، (الفیصل ناشران اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷ء)، ص:۲۰۳

۵۔ حافظ محمد نعیم، برصغیر کی سیرت نگاری میں فقہ السیرۃ کا اسلوب، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی وعلومِ اسلامیہ، (جی۔ سی۔ یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۶ء) ص:۱۲۵

اس ضمن میں لکھی جانے والی تمام کتب کا احاطہ تو ممکن نہیں البتہ عربی، فارسی اور اردو کتب سیرت میں سے فقہ السیرۃ کے حوالہ سے درج ذیل کتب سر فہرست ہیں۔

بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ	از مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی
مدارج النبوۃ	از شیخ عبد الحق محدث دہلوی
اصح السیر	مولانا عبد الرؤف داناپوری
سیرۃ المصطفیٰ ﷺ	مولانا ادریس کاندھلوی
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی
ضیاء النبی ﷺ	پیر محمد کرم شاہ الازہری (۱)

مذکورہ بالا کتب میں فقہ السیرۃ کا اسلوب بہت نمایاں ہے اس لیے ان کتب کی فہرست کو یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری کتب سیرت ایسی ہیں جن میں فقہ السیرۃ کا اسلوب اپنایا گیا ہے مگر ان میں واضح طور پر نہیں ہے اس لیے ان کتب کو یہاں فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔

۱۔ (برصغیر کی سیرت نگاری کا تذکرہ ان دو کتب کے تذکرے کے بغیر کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ ان میں ایک علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی ﷺ اور دوسری قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کی رحمت اللعالمین ہے۔ دونوں کتب سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے برصغیر اور عالم عرب میں مستند حوالہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ مگر فقہ السیرہ کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو واقعاتی سیرت نگاری سے دروس و عبر اور فقہی مسائل کے استنباط دونوں کتب میں نہیں کیا گیا۔ اگرچہ علامہ شبلی نعمانی نے روایات سیرت کی تنقیح اور مصادر و مراجع کے حوالے سے ایک بہت ہی عمدہ اور عالمانہ مقدمہ لکھا ہے جس سے بعض حضرات نے فقہ السیرۃ کی ہی ایک قسم قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ فقہ السیرۃ کی تعریف سے خارج ہے اس لیے علامہ کی کتاب کو شامل نہیں کیا گیا اور قاضی صاحب کی کتاب کو بھی اسی وجہ سے مندرجہ بالا فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔ (مزید تفصیل کے لیے مقالہ: برصغیر کی سیرت نگاری میں فقہ السیرۃ کا اسلوب از حافظ محمد نعیم ملاحظہ فرمائیں)

فصل دوم

غزوات و سرایا کا تعارف

ا۔ غزوات کا تعارف

ہجرت کے بعد کا تقریباً کل زمانہ حضور نبی کریم ﷺ کا مغازی و سرایا کی ترتیب میں گزرا۔ یہاں جن غزوات کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ اصلاً دفاعی غزوات ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک غزوہ اس سازش یا جارحیت کا جواب ہے جس کا آغاز مشرکین کی جانب سے ہوا تھا۔ اسی لیے ان کے ذریعہ زمانۂ نبوت میں اسلامی دعوت کے ایک مرحلہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسے اس حکم سے تعبیر نہیں کر سکتے جس کی بنیاد پر اسلام میں جہاد کی مشروعیت ہوئی۔ دعوت کے مختلف مراحل جیسا کہ خفیہ دعوت، اعلانیہ دعوت۔ اسی طرح جہاد بھی دعوت کا ایک مرحلہ ہے۔[1]

حکم جہاد دعوت کا وہ آخری مرحلہ ہے جس کے ماقبل مراحل کے ساتھ مل جانے سے ایک مکمل اسلامی حکومت معرض وجود میں آتی ہے۔ یہ مرحلہ ان واقعات پر مشتمل ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آئے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس مرحلے (جہاد) کی طرف اشارہ اس وقت فرمایا جب آپ ﷺ غزوۂ بنی قریظہ سے واپس آرہے تھے۔[2] اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((الْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ))[3]

ترجمہ: "اب ہم ان پر حملہ کریں گے وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے"۔

جہاد کی اجازت:

پہلی مرتبہ جہاد کا حکم نبوت کے مدنی دور سن ۲ھ میں نازل ہوا۔ اس سے قبل مسلمانوں کو طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں تھی، بلکہ صبر کی تلقین اور اس پر جنت کی بشارت دی جاتی تھی۔ جہاد کا حکم بھی بتدریج نازل ہوا۔ آغاز میں صرف اپنے دفاع کے لیے لڑنے کی اجازت دی گئی۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔ البوطی، فقہ السیرۃ النبویہ: ص: ۲۸۳

۲۔ ایضاً: ص: ۲۸۳

۳۔ بخاری، محمد بن اسمٰعیل ابو عبد اللہ، صحیح بخاری، دار ابن کثیر، (بیروت، الطبعہ الثالثہ، ۱۴۰۷ھ، ۱۹۸۷ء) كتاب المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حدیث: ۳۸۸۴، ص: ۴/۱۵۰۹

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾[1]

ترجمہ: "جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں، انہیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں بیشک ان کی مدد پر اللہ قادر ہے"۔

مکہ مکرّمہ میں تیرہ سال تک صبر وضبط کی تلقین کے بعد یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو کافروں کے خلاف تلوار اُٹھانے کی اجازت دی گئی۔ اِس سے پہلے مسلمانوں کو کفار کے ظلم وستم کا کوئی جواب دینے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ ہر زیادتی پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اوراس آیت میں جہاد کی حکمت یہ بھی بیان فرمائی گئی ہے، کہ جو لوگ ان آسمانی مذاہب کے مخالف تھے وہ ان کی عبادت گاہوں کو مٹانے کے درپے رہتے، اگر ان کے خلاف جہاد کی اجازت نہ دی ہوتی تو وہ ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کرڈالتے۔

اوراس حکم میں مفصل طور پر وہ وجوہات بھی درج ہیں جو مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت ملنے کا سبب بنیں۔

- **پہلی وجہ:** پہلی وجہ یہ ہے کہ مدافعت کرنے والوں کا مظلوم اور حملہ آوروں کا ظالم ہونا ہے۔ جیسے آج کل کا مروّجہ قانون "تعزیرات ہند" بھی "حفاظت خود اختیاری" کے نام سے جائز کہتا ہے۔
- **دوسری وجہ:** صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گھر بار سے نکالا جانا، املاک سے بے دخل کیا جانا، اور وہ بھی صرف اختلاف عقیدہ کی بنیاد پر۔ یعنی کہ یہ سب کے سب وہی مظلوم مسلمان تھے جن کو ہر قسم کی ایذائیں اور جلاوطنی کی سزا صرف اور صرف توحید کی وجہ سے دی گئی تھی۔
- **تیسری وجہ:** تیسری وجہ ایسی عام ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت صرف ان کے ذاتی، قومی یا مذہبی فوائد کی وجہ سے نہیں دی گئی بلکہ اس لیے بھی جہاد کی اجازت دی گئی کہ مسلمانوں نے جو معاہدات یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مختلف اقوام کے ساتھ ابھی حال ہی میں کیے تھے، اور جس فراخدلی سے ہر ایک مذہب کے لیے اس کی اپنی مذہبی آزادی عطا کی تھی اب اگر اس معاہدے کی حفاظت کے لیے مسلمان اپنی جانوں کو نہ لڑا دیں گے تو سب مذہبوں کی آزادی ختم ہو جائے گی اور سب کے مندر، گرجا گھر تہ خاک ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب کوئی معاہد قوم ہی معاہدہ کی حفاظت کرنے والی نہ رہے تو اس معاہدہ پر عمل کیسے ہو سکتا ہے۔

لہٰذا ان سب ضروری وجوہات کی بنا پر جہاد مسلمانوں کے لئے ضروری ٹھہرا دیا کہ وہ باوجود بے سروسامانی کے اور باوجود قلیل تعداد ہونے کے بھی ان حملہ آوروں کو مدینہ سے دور رکھیں گے۔

مقصد جہاد:

جہاد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول، اجتماعی عدالت کا قیام اور انسانی معاشرے سے بت پرستی کا خاتمہ اور

۱۔ الحج:۳۹/۲۲

اجتماعی احکام الٰہی کا نفاذ کرنا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ﴾(۱)

ترجمہ: "اور ان سے جنگ کرتے رہو تاکہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے تابع ہو جائے"۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ﴾(۲)

ترجمہ: "جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں نیک مقصد کے لیے جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ شیطان کی راہ میں طاغوتی مقاصد کے لئے جنگ کرتے ہیں"۔

اس آیت میں بنیادی طور پر جہاد کے دو مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل الطاغوت یعنی کہ محض دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے جہاد کرنا۔ جیسا کہ آج کل طاقتور ممالک محض مالی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے بعض کمزور ممالک پر جنگ کر کے قبضہ جمالیتے ہیں۔

اسلامی جنگ کے شعائر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو ہر وقت صلح کے لئے تیار رہنا چاہیے، کیونکہ اگر مقاصد مصالحت کے ذریعہ حاصل ہو جائیں تو ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہیں اور اگر دشمن خود صلح کی درخواست کرے تو اسے کھلے دل سے قبول کر لینا چاہیے لہذا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾(۳)

ترجمہ: "اور اگر وہ صلح کے لئے جھکے تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائے اور اللہ پر بھروسہ رکھیں بے شک وہی خوب سننے والا جاننے والا ہے"۔

اس آیت سے جہاد کی یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ معاملہ کو صلح سے حل کیا جائے تاکہ جنگ و قتال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

غزوہ کا لغوی معنیٰ:

لفظ غَزوَہ، (غین کے فتحہ اور زا کے فتحہ کیساتھ) اس کی جمع غزوات ہے۔ لغت میں جنگ کے معنی میں ہے اور اسی

۱۔ البقرۃ:۲/۱۹۳

۲۔ النساء:۴/۷۶

۳۔ الانفال:۸/۶۱

سے کلمہ "الغزو" ماخوذ ہے۔[1]

قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا﴾[2]

ترجمہ:" اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے حق میں جبکہ وہ سفر میں ہوں یا جہاد میں ہوں کہا کہ اگر یہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے"۔

اس آیت میں وارد ہونے والا لفظ **"غزی"** اسی قبیل سے ہے۔

غزوہ کی اصطلاحی تعریف:

اکثر مورخین اور ارباب سیر کی اصطلاح میں غزوہ ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جن کی قیادت میں رسول اللہ ﷺ نے بذات خود شرکت فرمائی ہو۔ اور زمانہ رسول ﷺ کی وہ جنگیں جن میں آنحضور ﷺ شریک نہیں ہوئے انہیں بعث یا سریہ کہا جاتا ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"ہر وہ لشکر جس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس خود موجود ہوں اسے غزوہ اور غزوات کہتے ہیں"[3]

غزوہ کی تعریف تمام محدثین، متقدمین اور سیرت نگاروں کے ہاں یکساں ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

غزوات کی اقسام:

غزوات کی دو قسمیں ہیں۔

- دفاعی
- اقدامی

دفاعی غزوات:

دفاعی جہاد میں کفار کو اسلام کی دعوت دینا ضروری نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کے پاس پہلے سے اسلام کا پیغام پہنچ چکا ہوتا ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو دعوت دینا ضروری نہیں ہوتا اور اس

۱۔ ابن منظور، لسان العرب، ص:۶۸، ۶۷، ۶۶

۲۔ آل عمران:۳/۱۵۶

۳۔ دہلوی، حضرت شیخ محقق علامہ شیخ محمد عبد الحق، مدارج النبوۃ، (مکتبہ اشتیاق، لاہور، طبع اولیٰ، ۲۰۰۴ء)، ص:۲/۱۱۲

دور میں پوری دنیا میں جہاں بھی جہاد ہو رہا ہے وہ دفاعی ہے اس لیے کہ اب اسلام کا علم اتنا عام ہے کہ کفار کو اسلام کے بارے میں خوب علم ہے بلکہ معلومات کی حد تک تو بعض کفار کو تو مسلمانوں سے بھی زیادہ علم ہے۔

اقدامی غزوات:

اقدامی جہاد میں بھی کفار کو ایمان کی دعوت دینا اس وقت ہے جب کہ کفار کو کسی بھی طرح سے اسلام کا علم نہ ہو مگر اس دور میں اسلام کا علم اتنا عام ہے کہ کفار کو اسلام کے بارے میں بخوبی علم ہے۔ اور اقدامی جہاد میں بھی قتال سے پہلے جو کفار کو دعوت دی جاتی ہے وہ اجمالی دعوت ہوتی ہے نہ کہ تفصیلی اور وہ بھی منت سماجت کے ساتھ نہیں بلکہ سینہ تان کر اور مجاہدانہ لب و لہجے میں تلوار لٹکا کر اور مسلح ہو کر اور یہی دعوت اتمام حجت ہے جس کا انکار موجب عذاب الہی ہے۔

غزوات کی تعداد:

موسیٰ بن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ستائیس غزوات میں رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے خود شرکت فرمائی۔ اور نو (۹) غزوات میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اپنے ہاتھ سے قتال بھی فرمایا۔ بدر، احد، مریسیع، خندق، قریظہ، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف اس تعداد پر اجماع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسے آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے لیے خصوصیت کے ساتھ نفل قرار دیا تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بنی نفیر کے غزوہ میں بھی قتال فرمایا۔ خیبر سے واپس آتے ہوئے وادئ القراء میں بھی قتال فرمایا اور آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے بعض اصحاب اس میں مقتول ہوئے۔ اور اسی طرح غابہ میں بھی قتال فرمایا۔ [1]

باقاعدہ جنگ کا آغاز:

صحیح احادیث اور آثار کے مطابق جنگ کی مشروعیت کی ابتداء ہجرت کے بعد ۲ھ میں ہوئی اور اس کا عملی مظاہرہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی ہجرت مدینہ کے بارہ ماہ بعد صفر میں ہوا۔ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اس موقع پر پہلی مرتبہ جس غزوہ کی نیت سے نکلے اسے "غزوۂ ودان" کہتے ہیں۔ اس میں آپ کا ارادہ قریش اور بنو حمزہ سے جنگ کرنے کا تھا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ بنو حمزہ نے جنگ سے قبل ہی صلح کر لی اور نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور صحابہ کرام بغیر جنگ کے مدینہ لوٹ آئے۔ [۲]

مقالہ ھٰذا میں تمام غزوات کا احاطہ کرنا مشکل ہے لہٰذا اس میں انہی غزوات کے اسباب پر تبصرہ کیا جائے گا جو فقہ السیرۃ کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ اور صاحب اصح السیر نے جن غزوات کے دروس و عبر اور اسباب و نتائج پر تبصرہ کیا ہے۔ لہٰذا اس مقالہ میں ان اہم دفاعی اور اقدامی غزوات کو نمایاں کر کے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جن میں

۱۔ زہری، محمد بن سعد بن منیع، الطبقات الکبری، (دار الکتب العلمیہ، الطبعہ الاولی ۱۴۱۰ھ، ۱۹۹۰ء) ص: ۲۴۵

۲۔ البوطی، فقہ السیرۃ النبویہ، ص: ۲۸۴

صاحب اصح السیر نے دروس و عبر اور نصائح پر بحث کی ہے۔

دفاعی غزوات:

تقریباً اکثر معرکوں کی ابتداء مشرکین مکہ یا یہودیوں نے امن و امان کو خراب کرنے کے لیے کی تھی۔ اس لیے بطور دفاع آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سامنے آکر مقابلہ کیا اور فتنہ کی آگ کو بجھا کر عداوت و خیانت کا قلع قمع کیا۔ اور بعض غزوات ایسے بھی ہیں جن میں آپ ﷺ نے پیش رفت فرمائی یعنی اقدامی جہاد کیا لیکن ان میں بھی کہیں نہ کہیں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ کفار مسلمانوں کا امن خراب کرنا چاہتے تھے جس کی قبل از وقت خبر ہونے کی وجہ سے یا کسی حکمت پیش نظر آپ ﷺ نے پہل کی۔

غزوۂ بدر سے پہلے کے غزوات

- **غزوۂ ودان:** یہ پہلا غزوۂ ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ باقاعدہ طور پر غزوہ کی نیت سے نکلے۔ اس کو "غزوۃ الابواء" بھی کہتے ہیں۔ ماہ صفر میں ہجرت کے بارہویں مہینہ مدینہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر آپ ﷺ غزوۂ کے لیے نکلے، آپ ﷺ کی جماعت کا علم سفید تھا۔ علم دار حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے۔ مقام ودان تک قریش کی ایک جماعت کے ساتھ مزاحمت کی غرض سے گئے تھے۔ مگر وہ لوگ وہاں نہ ملے۔ اس وقت وہاں بنی ضمرہ کا سردار عمر بن مخشی الضمیری موجود تھا جس سے آپ ﷺ نے تحریری مصالحت کی اور لوٹ آئے۔[1]

اس غزوۂ سے تین باتیں معلوم ہوئی ہیں ایک یہ کہ جب حضور ﷺ مدینہ سے باہر جاتے تھے تو آپ ﷺ مدینہ میں خلیفہ مقرر فرما کر جاتے تھے اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنی جگہ پر نائب کا مقرر کرنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ لشکر کے اندر علمبردار کو ہونا بہت ضروری ہے اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب کوئی صلح کے لئے آمادہ ہو کر صلح کی پیش کرے تو اس کے ساتھ صلح کر لینی چاہیے اور یہ کہ اس کے لئے صلح نامہ تحریری شکل لکھ لینا چاہیے۔ اس لیے کہ فریقین میں جن شرائط پر صلح ہوئی ہے اس کا تحریری ثبوت ہو تاکہ کوئی بھی اپنی شرائط سے مکر نہ سکے۔

- **غزوۂ بواط:** ربیع الاول کے مہینہ میں ہجرت کے تیرھویں ماہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو مدینہ پر خلیفہ بنا کر نبی کریم ﷺ خود غزوہ کے ارادہ سے نکلے۔ علم سفید تھا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ علم دار تھے۔ قریش کی ایک جماعت کی مخالفت مقصود تھی جس میں امیہ بن خلف الجمحی ایک سو قریش اور دو ہزار پانچ سو اونٹ کے

۱۔ داناپوری، حکیم محمد ابوالبرکات، عبدالرؤف، اصح السیر فی ھدی خیر البشر، (طبع اولی، ۱۹۸۷ء، مکتبہ البشریٰ ویلفئیر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ، کراچی، پاکستان، ۱۴۳۶ھ، ۲۰۱۵ء) ص: ۱۶۰

ساتھ تھا۔ آپ ﷺ بواط تک گئے مگر دشمن نہ ملے۔ اس لیے لوٹ آئے۔(۱)

بواطا شام کی راہ میں جحفہ کے قریب جبال جہینہ میں ایک دو شاخہ پہاڑ ہے۔(۲) اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ محض دین کی وجہ سے مال واسباب سے بے دخل کرنے والوں سے بدلہ لیناچاہیے۔ اس غزوہ میں دشمن کی مزاحمت کرنا مقصود تھا جس کے لیے آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تشریف لے گئے مگر وہاں وادیٔ بواط میں دشمن سے آمنا سامنا نہ ہوا اس لیے واپس تشریف لے آئے۔

- **غزوۂ سفوان یابدرِاولیٰ:** اسی مہینہ ماہ ربیع الاوّل میں نبی کریم ﷺ نے کرز بن جابر الفہری کا تعاقب کیا اس نے مدینہ کی چراگاہ میں اونٹوں پر ڈاکا ڈالا تھا جن میں حضور ﷺ کے اونٹ بھی تھے۔ اس دفعہ مدینہ پر آپ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا اور خود اس کے تعاقب میں نکلے۔ علم سفید تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ وادیٔ سفوان (جو بدر کے قریب ہے) تک اس کے تعاقب میں گئے مگر وہ نہ ملا تو لوٹ آئے۔(۳) اس غزوۂ کو "غزوۂ بدر اولی" بھی کہتے ہیں۔(۴)

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں پر حملہ کرنے والوں کو ہرگز معاف نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے وہ مسلمانوں کی جانوں پر حملہ کریں مسلمانوں کی عزت پر حملہ کریں یا مسلمانوں کے مال پر حملہ کریں۔ تو اس لیے آپ ﷺ کرز بن جابر الفہری کے پیچھے وادی صفوان تک گئے تاکہ اس کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے وہ نہ ملا تو پھر آپ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔

- **غزوۂ ذی العشیرہ:** اس کے بعد ہجرت کے سولہویں مہینہ جمادی الاخریٰ میں مدینہ پر ابوسلمہ بن عبدالاسد المخزومی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا اور حضور نبی کریم ﷺ خود ڈیڑھ سو یا دو سو مہاجرین کو ساتھ لے کر قریش کی ایک جماعت کی مزاحمت کے لیے نکلے۔ آپ ﷺ کو خبر ملی کہ قریش کی ایک جماعت قریش کا مالِ تجارت لے کر شام کے لیے مکہ سے روانہ ہو چکی ہے۔ آپ ﷺ اسی کی تلاش میں نکلے۔ ینبوع(۵) کے قریب ایک مقام تک تشریف لے گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کہ کئی روز پہلے یہ قافلہ یہاں سے آگے نکل چکا ہے۔ اسی سفر میں

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۶۰

۲۔ دہلوی، مدارج النبوت، ج:۲، ص:۱۲۹

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۶۰

۴۔ زرقانی، امام احمد بن محمد قسطلانی المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ، مترجم: مولانا محمد صدیق ہزاروی، (مکتبہ فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور) ج:۱، ص:۴۰۲

۵۔ یہ ینبع میں بنی مدلج کے ایک مقام کا نام ہے۔ مصری حجاج کی ایک منزل ہے۔ (ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۱۴۸)

آپ ﷺ نے بنی مدلج اور ان کے حلیف بنی ضمرہ سے مصالحت کی۔ یہی قافلہ جب شام سے لوٹا تو پھر آپ ﷺ مزاحمت کے لیے نکلے جو بدرِ کبریٰ واقع ہوا۔[1]

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کفار کو معاشی طور پر بھی کمزور کرنا چاہیے اس لیے آپ ﷺ نے ان کے تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ مال اور پیسہ وغیرہ مکہ نہ لے کر جائیں جس سے وہ مسلمانوں کے پر حملے کے لیے اچھی تیاری کر سکیں۔ آپ ﷺ کی یہی پیشرفت غزوہ بدر کبری کا سبب بنی تھی۔

غزوۂ بدر کبریٰ:

اس غزوہ کو "غزوۂ بدر کبریٰ" اور "غزوۂ بدر عظمیٰ" بھی کہتے ہیں۔[2] یہ پہلا غزوۂ ہے جس میں کفار قریش کا مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑا مقابلہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح یاب کیا جس کے بعد اسلام کی حالت میں بہت بڑا تغیّر واقع ہوا۔

غزوۂ بدر کا سبب:

غزوۂ بدر کا سبب یہ ہوا تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ کو جب معلوم ہوا کہ قریش کا تجارتی قافلہ ابوسفیان بن حرب کی نگرانی میں شام سے آرہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ یہ قریش کا قافلہ ہے جنھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکال دیا۔ اور تمہارے اموال پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ چلو شاید اللہ تعالیٰ تم کو اس کا بدلہ دلا دے۔[3]

میدانِ بدر کی طرف روانگی:

حضور نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ نکلے۔ کل تین سو سے کچھ زیادہ مسلمان اس غزوہ میں شریک ہوئے جس میں ۸۶ مہاجر، ۶۱ اوس کے لوگ اور ۱۷۰ خزرج کے آدمی تھے۔ ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق ان لوگوں کی تعداد تین سو چودہ تھی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کے پاس صرف تین گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ ایک اونٹ پر دو یا تین صحابہ یکے بعد دیگرے سوار ہوتے تھے۔[4]

دوسری طرف ابوسفیان قافلے کو بچا کر نکال لے گیا۔ انہوں نے مکہ جانے کے لیے ساحل کا راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ اپنے قافلے اور مال تجارت کو خطرے سے بچالیا۔ اور ابو سفیان نے قریش کو خبر بھجوائی کہ وہ قافلے کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے اس لیے وہ لوگ مکہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابو جاہل نے آگے بڑھنے پر صرار کیا۔ اس نے کہا

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۶۱

۲۔ دہلوی، مدارج النبوۃ، ص:۲/ ۱۱۸

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۶۳

۴۔ ایضاً، ص:۱۶۳

کہ اللہ کی قسم ہم واپس نہیں ہونگے یہاں تک کہ میدانِ بدر پہنچ جائیں۔

نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی کہ قریش مسلمانوں سے جنگ کے ارادہ سے نکلے ہیں تو آپ ﷺ نے مسلمانوں سے مشورہ کیا جس پر مہاجرین و انصار نے دل وجان سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے اپنی جانیں حاضر کر دیں۔ ۱۷ رمضان جمعہ کی رات نبی کریم ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں تضرّع (عاجزی وانکساری) کے ساتھ دعاء کی اور مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری سنائی۔

جنگ کا آغاز:

اگلے دن یعنی جمعہ کے روز صبح مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مٹھی ریت کی لی اور "شَاهَتُ الوُجوه" کہتے ہوئے اسے مشرکین کی جانب پھینکا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کفار کی فوج کے ہر شخص کی آنکھ میں یہ ریت بھر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرشتوں کے ذریعہ فرمائی۔[۱] جنگ کا خاتمہ مسلمانوں کی عظیم فتح کی صورت میں ہوا۔ اس جنگ میں کفار مکہ کے ستّر سردار مارے گئے اور اتنے ہی قیدی کیے گئے۔ مسلمانوں میں سے ۲۲ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش فرمایا۔ جن میں ۱۴ مہاجر، ۲ خزرج اور ۶ اوس کے آدمی تھے۔[۲]

اس غزوہ سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حربیوں کی عام مملوکہ چیزیں مسلمانوں کے لیے حلال ہیں۔ "مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ حربیوں کی عام مملوکہ چیزوں پر قبضہ کرلیں اور انہیں اپنے تصرف میں لائیں"۔[۳] اس لیے اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ حربیوں کی جو چیزیں مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں وہ ان کی ملکیت تصور کی جائیں گی۔ اس واقعہ میں غور کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ معاملات میں کس قدر مشورے کا اہتمام کرتے تھے۔ اسی وجہ سے " تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایسے تمام معاملات جن میں قرآن وسنت کا کوئی حکم منصوص نہ ہو، مشورہ کرنا بہت ضروری ہے"۔[۴] اس کے ساتھ تمام فقہاء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اگرچہ امیر کو مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اسے قبول کرنا اس کے لیے لازم نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مشورہ کرنا تو سنت عمل ہے لیکن امیر کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ اس پر عمل بھی کرے۔

قارئین کی آسانی کے لیے غزوۂ بدر کے واقعات سے حاصل ہونے والے چند ایک جنگی اصولوں کو نکات کی شکل میں ذکر کیا جارہاہے، ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ غزوۂ بدر میں فرشتوں کے ذریعے اہل ایمان کی مدد والی حدیث صحیحین کی ہے۔ (داناپوری، اصح السیر، ص:۱۷۳)

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۷۳

۳۔ البوطی، فقہ السیرۃ النبویہ، ص:۲۸۹

۴۔ ایضاً، ص:۲۹۰

- قیدیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا سنتِ رسول ہے۔
- حکمران کے لیے جائز ہے کہ قیدیوں سے فدیہ لے یا انہیں بغیر فدیہ لیے چھوڑ دے۔
- ایک ہی خاندان کے اگر کئی افراد قید میں ہوں تو آپ ﷺ ان میں تفریق کرنا ناپسند فرماتے تھے اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص قید میں بیٹے کو اس کی ماں سے جدا کرے گا اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کو اس کے احباب سے جدا کرے گا۔
- غزوۂ بدر کے واقعات سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ حکمراں کے لیے جائز ہے کہ جہاد کے لیے یا دوسرے کاموں کے لیے مخبروں اور جاسوسوں سے مدد لے اور انہیں دشمنوں میں پھیلا دے تاکہ مسلمانوں کو ان کے منصوبوں اور حالات کا علم ہو سکے۔

غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کے درمیان کے غزوات

غزوۂ بدر کے بعد مسلمان آرام سے نہیں بیٹھے، بلکہ مختلف قبائل کے ساتھ مختلف اوقات میں کفار سے آمنا سامنا ہوتا رہا۔ اس طرح بدر اور احد کے درمیان کافی سارے چھوٹے غزوات ہوئے جن میں سے بعض غزوات میں لڑائی کی نوبت آئی اور بعض میں نہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل غزوات کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

- **غزوۂ بنی سلیم:** حضور ﷺ جب بدر سے مدینہ واپس آئے تو اس کے سات روز بعد بنی سلیم کی طرف جنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ وجہ یہ بنی کہ معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ آپ ﷺ کے خلاف جنگ کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ ان کے پیچھے ماء الکدر تک گئے لیکن وہ لوگ نہ ملے۔ آپ ﷺ نے وہاں تین روز تک قیام فرمایا پھر جنگ کیے بغیر مدینہ واپس لوٹ آئے۔[1]

اس غزوۂ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر اس چیز کا علم ہو جائے کہ دشمن آپ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو دفاع کا تقاضا یہ ہے کہ دشمن کے حملہ کرنے سے پہلے خود اس پر حملہ کر دیا جائے تاکہ دشمن اپنی تدبیروں میں ہی ناکام ہو جائے۔ اور آپ ﷺ کا دشمن کے انتظار میں وہاں تین دن قیام کرنا دشمن پر رعب ڈالنے کے لئے تھا۔

- **غزوۂ سویق:** غزوۂ بدر کے دو مہینہ بعد غزوۂ سویق ہوا۔ وجہ یہ بنی کہ انتقام بدر کی غرض سے ابو سفیان دو سو آدمیوں کے ساتھ پوشیدہ بنو نضیر کے سردار کے پاس آیا اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ واپسی پر عریض کے مقام پر ایک انصاری صحابی کو قتل کر دیا اور بھاگا۔ حضور ﷺ کو

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۷۷

اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے تعاقب کیا اور قرقرۃ الکدر [1] تک اس کے پیچھے گئے مگر وہ نہ ملا۔ اور آپ ﷺ واپس مدینہ لوٹ آئے۔ واپسی پر کفار بھاگتے ہوئے بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے بہت سا ستو پھینکتے گئے تھے جو پیچھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ملا۔ اس لئے اس غزوہ کا نام غزوہ سویق ہو گیا۔ [2]

غزوۂ سفوان کی طرح اس غزوۂ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی جانوں اور مال پر حملہ کرنے والے کو آپ ﷺ نے ہرگز معاف نہیں فرمایا۔ کیونکہ ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کی کھجوروں کے باغ کو نقصان پہنچایا اور ایک انصاری کو شہید کر دیا تھا اس لیے آپ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ مقام الکدر تک اس کے تعاقب میں گئے وہ نہ ملے تو پھر آپ ﷺ واپس مدینہ لوٹ آئے۔

- **غزوۂ بحران:** غزوۂ بنی غطفان کے بعد ربیع الاوّل پورا مہینہ حضور ﷺ مدینہ میں رہے پھر ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر قریش سے مقابلہ کی غرض سے نکلے۔ مقام بحران [3] تک تشریف لے گئے اور ربیع الآخر اور جمادالاولیٰ آپ ﷺ وہیں رہے مگر لڑائی نہ ہوئی اور آپ ﷺ واپس لوٹ آئے۔ [4]

اس غزوہ میں ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر کفار کے مقابلے کی نیت سے جانا اس بات کی قوی اور واضح دلیل ہے کہ اپنا قائم مقام یعنی خلیفہ بنا کر جانا ضروری ہے اگرچہ اس کے لیے کوئی معذور شخص ہی میسر ہو۔ یعنی کہ امیر المومنین کو کسی حال میں بھی اپنا مقام خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

- **غزوۂ بنی قینقاع:** اس غزوہ کا سبب یہ بنا کے یہود غزوۂ بدر کے بعد حضور ﷺ سے بغض وعناد کا اظہار کرنے لگے۔ ایک دن انھوں نے یہ کیا کہ ایک مسلمان عورت بازار میں ایک سنار کے سامنے بیٹھی تھی کہ ایک یہودی نے آکر پیچھے سے اس کا پلو باندھ دیا۔ جب وہ اٹھنے لگی تو اس کا ستر کھل گیا۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے، اس پر اس عورت نے فریاد کی تو وہاں ایک مسلمان قریب کھڑا تھا اس نے تلوار کھینچ کر سنار کو یا اس یہودی کو قتل کر دیا۔ یہود قوم جمع ہوئی اور انہوں نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ اس واقعہ کا علم جب آپ ﷺ کو ہوا تو آپ ﷺ نے یہودی قبیلہ بنو قینقاع کے لوگوں کو بلا کر نصیحت فرمائی۔ تو وہ آپ ﷺ کے سامنے بیہودہ گوئی کرنے لگے اور نامعقول باتیں بکنے لگے تو حضور ﷺ سمجھ گئے کہ یہ لوگ نقض عہد پر راضی ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے

۱۔ قرقرۃ (ہموار زمین) الکدر (ٹیالہ رنگ والا پرندہ)، اس جگہ کو قرقرۃ الکدر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے پرندے وہاں رہتے تھے۔ (ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۱۵۱)

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۷۸

۳۔ مقام بحران فرع کے قریب واقع ہے۔ اور فرع مدینہ سے چار دن کی مسافت پر واقع ایک مقام ہے۔ (ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۱۵۴)

۴۔ (بائے موحدہ اور حائے مہملہ سے) حجاز کا ایک معدن ہے، اور مشہور مقام فرعہ کے قریب ہے۔ عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے کے سریہ میں بھی اس مقام کا ذکر ہے اور بعض روات کی نسبت بحرانی اسی مقام کی طرف ہے۔ (داناپوری، اصح السیر، ص:۱۷۸)

جنگ کی تیاری شروع فرمادیں۔[1] غزوۂ بحران سے واپسی کے بعد حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کچھ عرصہ مدینہ میں قیام فرمایا پھر شوال کے مہینہ میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہودیوں کے قبیلہ بنو قینقاع کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ پندرہ روز تک جاری رہا آخر کار یہودیوں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور جلا وطن ہو گئے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں اسلحہ اور سونے کے کام کے اوزار ملے۔[2]

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عہد شکنی کرنے والوں سے اگر امن کی امید نہ رہے تو پھر انہیں جلا وطن کر دینا چاہیے۔ جس طرح اس غزوہ میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے عہد شکنی کرنے والے یہود کے قبیلہ بنی قینقاع کا محاصرہ کر کے ان کو جلا وطن کر دیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر دشمن سے تادیر امن کی امید نہ ہو تو اس کو جلا وطن کر دینا چاہیے۔

غزوۂ احد:

سن ۳ ہجری ۷ شوال کو یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ہجرت کو بتیس مہینے گزر چکے تھے۔

غزوۂ احد کا سبب:

غزوۂ احد کا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے غزوۂ بدر میں کفار قریش کے بڑے بڑے اشراف قتل ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے قریش کو بدر میں شدید صدمہ پہنچا تھا جس کا بدلہ لینے کے لیے کفار قریش نے اپنے سردار ابوسفیان کی راہنمائی میں مدینہ پر حملے کی زبردست تیاری شروع کر دی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس میں تہامہ اور کنانہ کے قبائل نے قریش کا ساتھ دیا۔ اس طرح ابوسفیان پورے سازوسامان سے لیس تین ہزار آدمیوں اور دوسو گھڑ سوار کا لشکر لیکر مدینہ کی طرف روانہ ہوا اور اپنی عورتوں کو بھی ساتھ کر لیا تاکہ ان کی حمایت اور غیرت کی وجہ سے کوئی بھاگ نہ سکے۔ اور جبل احد کے قریب مقام عینین میں آکر پڑاؤ ڈالا۔

جنگ کی تیاری:

جب مدینہ میں حضور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو قریش کی خبر پہنچی تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، مطلب یہ کہ مدینہ میں ہی رہ کر مقابلہ کیا جائے یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے؟ جس پر کبار صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکال کر مقابلہ کیا جائے، جبکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر ہی کفار کے حملے کا جواب دیا جائے۔

الغرض آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم کے ولولہ اور جوش کو دیکھ کر مدینہ سے باہر نکل کر حملہ کرنے کو ترجیح

۱۔ دہلوی، مدارج النبوت، ج:۲، ص:۱۴۵

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۷۹

دی اور ے شوال جمعہ کے روز جمعہ کی نماز کے بعد نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایک ہزار صحابہ کرام رضی اللّٰہ عنہم کے لشکر کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ راستے میں عبد اللہ بن ابی بد عہدی کرتے ہوئے تین سو منافقین کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم احد پہنچے اور وادی کے کنارے اس طرح ٹھہرے کہ جبلِ احد کو پشت کی جانب کیا اور منع کر دیا کہ جب تک ہم حکم نہ دیں کوئی شخص بھی قتال شروع نہیں کرے گا۔

جنگ کا آغاز:

صبح کے وقت قتال کی تیاری ہوئی جس میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ سات سو آدمی تھے۔[۱] جن میں پچاس گھڑ سوار تھے۔[۲] آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے پچاس تیر اندازوں کو عبد اللہ بن جبیر رضی اللّٰہ عنہ[۳] کے ماتحت فوج کے پیچھے ایسی جگہ مقرر کر دیا کہ جہاں سے اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں پشت کی جانب سے حملہ نہ کر دے۔ اور ان سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ:

> "جہاں تمہیں مقرر کیا گیا ہے وہیں ڈٹے رہو اور ہماری پشت کی حفاظت کرو۔ اگر تم دیکھو کہ ہمیں فتح حاصل ہو گئی ہے تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا اور اگر دیکھو کہ ہمیں شکست ہو رہی ہے اور ہمیں قتل کیا جا رہا ہے تو بھی ہماری مدد کے لیے یہاں سے نہ ہٹنا۔"[۴]

اس کے بعد لڑائی کا آغاز ہوا۔ دن کے اوّل وقت مسلمانوں کی فتح تھی، یہاں تک کہ کفار پسپا ہوتے ہوئے اس جگہ تک پہنچ چکے تھے جہاں ان کی عورتیں تھیں۔ لیکن پھر غلطی یہ ہوئی کہ جب تیر انداز مسلمانوں نے کفار کی شکست دیکھی تو وہ "الغنیمه الغنیمه" کہتے ہوئے میدان میں چلے آئے اور اس جگہ کو چھوڑ دیا۔ جہاں ان کو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مقرر فرمایا تھا حالانکہ حضرت جبیر رضی اللّٰہ عنہ ان کو روکتے رہے۔ قریش کے سواروں نے جب اس جگہ کو خالی پایا تو مسلمانوں کی پشت کی جانب سے آ گئے اور مسلمانوں کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اس اچانک صورتِ حال سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور ستّر صحابہ رضی اللّٰہ عنہم شہید ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی کفار میں گھر گئے اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔ مسلمانوں کو مشرکین کی طرف سے بہت جانی نقصان پہنچا اور اس غزوۂ میں مسلمانوں کو شکست ہو گئی۔[۵]

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ "نبی جب اسلحہ پہن لے تو نبی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دشمن سے فیصلہ

۱۔ کیونکہ ہزار میں سے تین سو عبد اللہ بن ابی کے ساتھ واپس ہو گئے تھے۔ (داناپوری، اصح السیر، ص:۱۸۱)

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۸۱

۳۔ عبد اللہ بن جبیر انصاری رضی اللّٰہ عنہ خوات بن جبیر رضی اللّٰہ عنہ کے بھائی ہیں۔ (داناپوری، اصح السیر، ص:۱۸۱)

۴۔ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، سیرت النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، (مکتبہ: البیروت) ص:۵/۱۲۹

۵۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۸۵

کیے بغیر اسلحہ اتار دے"۔[1] غزوۂ احد کے واقعات سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں اس موقع پر عبد اللہ بن ابیٔ منافق کا پیچھے ہٹ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ منافقین یا تو اسلام کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا مصیبتوں اور آزمائشوں سے بچنا چاہتے ہیں جو کہ منافقین کی نمایاں صفت ہے۔

اس کے علاوہ اس غزوہ سے حاصل ہونے والے دروس و نصائح کو نکات کی شکل میں ذکر کیا جا رہا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

- منافق پر بھروسہ جائز نہیں کیونکہ وہ کبھی بھی مصیبت میں ساتھ نہیں دیتا۔
- مسلمانوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا یہودیوں سے مدد لینے پر آمادہ نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کفار کے خلاف کفار کی مدد لینا جائز نہیں۔
- چند تیر اندازوں کو اتنی اہم جگہ پر قبل از وقت مقرر کرنا اور ان کو پابند کرنا کہ کسی صورت بھی اس جگہ کو نہیں چھوڑنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نبی ہونے کے ساتھ فنون جنگ میں ماہر اور بہترین منصوبہ بندی کرنے والے تھے۔ یعنی کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس قیادت عسکری سے متصف تھی۔
- اس غزوۂ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دکھا دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی ادنیٰ سی مخالفت بھی کیسے کیسے مصائب کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے مسلمان کے لیے سنّت رسول ﷺ کی مخالفت قطعاً ناجائز و حرام ہے۔

صاحب کتاب نے اس غزوۂ کے ضمن میں شہداء کی تجہیز و تکفین کے متعلق فقہی مسائل پر بحث کی ہے اور اپنا موقف بھی بیان کیا ہے۔ جس کا ذکر دوسرے باب میں ہے جو کہ فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ ان مسائل کے مطالعہ کے لیے مقالہ کا تیسرا باب ملاحظہ فرمائیں۔

احد کے بعد کے غزوات

غزوۂ احد سے لوٹ کر جب حضور ﷺ مدینہ آئے تو بقیہ شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ آپ ﷺ مدینہ میں ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد محرم ۴ ہجری سے دوبارہ آپ ﷺ نے غزوات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان مندرجہ ذیل غزوات کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

➢ **غزوۂ بنی نضیر:** واقعۂ بیرِ معونہ کے بعد غزوۂ بنی نضیر ہوا۔ چار ہجری ماہ ربیع الاول میں پیش آیا۔ غزوۂ احد کے بعد یہودیوں کے قبیلہ بنو نظیر نے آپ سے عہد شکنی کر کے ابوسفیان کے حلیف بن گئے تو آپ ﷺ نے ان کو پیغام بھیجا کہ دس دن کے اندر وہ قلعہ چھوڑ دیں اور چلے جائیں یہاں سے جب انہوں نے آپ ﷺ کی بات نہ مانی تو حضور ﷺ بنو نضیر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی آپ ﷺ نے بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ طویل

ا۔ البوطی، فقہ السیرۃ النبویہ، ص:۳۲۶

ہوا تو بنو نضیر نے محاصرے سے تنگ آکر رسول اللہ ﷺ سے صلح کی درخواست کی، آپ ﷺ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا اور انہیں اپنے اموال سمیت جانے کی اجازت عطا فرمائی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو بہت سا اسلحہ اور بنو نضیر کی زرخیز زمین اور مکانات مال غنیمت کی صورت میں ملے۔[۱]

اس غزوۂ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اور عہد شکنی کرنے والوں کو ہر گز معاف نہیں کرنا چاہیے اور پہلی مرحلے میں ان کو ڈیڈ لائن دینی چاہیے جیسا کہ آپ ﷺ نے بنو نضیر کو دس دن کی مہلت دی انہوں نے انکار کیا تو پھر آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا یہاں تک کہ وہ جلاوطن ہونے پر راضی ہوگئے۔ یعنی اگر پیار سے بات نہ مانیں تو پھر ان سے جنگ کرنا ان کا محاصرہ کرکے ان کو جلاوطن کرنا بالکل درست ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع: جمادالاولی یا محرم ۴ ہجری میں بنی غطفان کے قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ کے مقابلہ کی غرض سے خود حضور ﷺ نکلے۔ "اس غزوہ کا سبب یہ بنا کہ ایک شخص مدینہ منورہ میں بکریاں فروخت کرنے کے لیے لایا اس نے اصحاب رسول ﷺ کو بتایا کہ بنی غطفان کے بنی انمار، اور بنی ثعلبہ نے ایک لشکر جمع کیا ہے اور وہ مدینہ پر حملہ کا ارادہ رکھتے ہیں"۔[۲] حضور ﷺ نے مدینہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس غزوۂ میں آپ ﷺ کے ساتھ چار سو آدمی تھے اور بعض میں ہے کہ سات سو آدمی تھے۔ بنی غطفان کی ایک بڑی جماعت مقابلہ میں آئی مگر جنگ نہ ہوئی۔ اور حضور ﷺ وہاں سے واپس لوٹ آئے۔[۳]

اس غزوہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر دشمن کی تیاری کا علم ہو جائے کہ وہ آپ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اس کے حملہ کرنے سے پہلے آپ کا اس پر حملہ کر دینا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے اس غزوہ میں بنی غطفان اور بنی ثعلبہ کے ساتھ کیا۔

- **غزوۂ بدر ثانیہ:** غزوۂ احد سے لوٹتے وقت ابوسفیان نے کہا تھا کہ ہمارا تمہارا وعدہ ہے کہ آئندہ سال بدر میں مقابلہ ہوگا حضور ﷺ نے بھی قبول فرمایا۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی چار ہجری شعبان یا ذیقعدہ میں حضور ﷺ اس وعدہ کے مطابق روانہ ہوئے۔ اس غزوۂ میں پندرہ سو آدمی اور دس گھوڑے آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ادھر ابوسفیان بھی مکہ سے دو ہزار آدمی اور پچاس گھوڑوں کے ساتھ نکلا۔ ابوسفیان مکہ سے ایک منزل دور

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۰۴

۲۔ دہلوی، مدارج النبوت، ص: ۲/ ۲۸۳

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۰۵-۲۰۶

مقام ظہران تک یا عسفان (۱) تک آیا وہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ یہ سال جنگ کے لیے مناسب نہیں ہے چنانچہ وہیں سے واپس لوٹ گیا۔ اس سال خشک سالی تھی۔ (۲)

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی سے وعدہ کیا جائے تو اس وعدے کو پورا کرنا لازمی ہے اس لیے آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے اور سات روز تک آپ ﷺ نے ابوسفیان کا انتظار کیا اور جب اس کے لوٹ جانے کی خبر آپ ﷺ تک پہنچی تو پھر آپ ﷺ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔

➢ **غزوۂ دومۃ الجندل:** (اصل لغت میں دُومہ بضم دال وجَندَل بفتح جیم وفتح دال ہے) حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ دومۃ الجندل (۳) میں بہت سے مشرکین جمع ہوئے ہیں اور مدینہ پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ربیع الاول ۵ ہجری میں سباع بن عرفطہ الغفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا خلیفہ مقرر فرما کر ایک ہزار مسلمانوں کے ساتھ دومۃ الجندل کا رخ کیا اور بنی عذرہ کے ایک شخص کو راستہ بتانے کے لئے ساتھ لیا یہ مقام مدینہ سے پندرہ دن کی مسافت پر ہے۔ جب دومۃ الجندل والوں کو حضور ﷺ کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ حضور ﷺ جب وہاں پہنچے تو کوئی نہ ملا۔ چند روز آپ ﷺ وہاں ٹھہرے مختلف اطراف میں سرایا بھیجے مگر کوئی مقابلہ نہ ہوا اور پھر آپ ﷺ واپس مدینہ لوٹ آئے۔ (۴)

اس غزوہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر دشمن کی تیاری کا علم ہو جائے تو از خود اس پر حملہ کر دیا جائے اور اس طرح کرنے سے دشمن پر رعب پڑ جاتا ہے اور اکثر لڑائی کی نوبت بھی نہیں آتی اور لڑائی سے پہلے دشمن کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ جیسا کہ اس غزوہ میں آپ ﷺ نے دومۃ الجندل والوں کے ساتھ کیا اور وہ آپ ﷺ کے رعب کی وجہ سے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

➢ **غزوۂ بنی المصطلق:** (مصطلق بنی خزاعہ کے ایک شخص جزیمہ بن سعد کا لقب ہے) اور بنی خزاعہ کا ایک کنواں ہے جس کو مریسیع کہتے ہیں۔ اس غزوۂ میں حضور ﷺ اسی کنویں پر ٹھہرے تھے اس لیے اس غزوۂ کو مریسیع (۵) بھی کہتے ہیں۔

۱۔ مقام ظہران یا عسفان مکہ سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے۔ (ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۱۵۹)

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۷

۳۔ مدینہ منورہ سے پندرہ یا سولہ دن کی مسافت پر ہے، اور دمشق سے پانچ دن کی مسافت پر ہے۔ (ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۱۶۰)

۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۷

۵۔ بنی المصطلق بنی مدلج کے حلیف تھے۔ بنی المصطلق اپنے ایک کنواں پر اترا کرتے تھے جس کا نام المریسیع تھا۔ اس کے اور الضرع کے درمیان تقریباً ایک دن کی مسافت تھی اور مدینہ کے درمیان (۹۶) میل کا فاصلہ تھا۔ (ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۲۹۵)

یہ غزوۂ شعبان ۵ ہجری[۱] میں پیش آیا۔ وجہ اس غزوۂ کی یہ تھی کہ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ حارث بن ابی ضرار بنی المصطلق کا سردار اپنی قوم اور دوسرے عرب قبائل کو لے کر رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلا ہے۔ حضور ﷺ نے پہلے بریدہ بن الحصیب الاسلمی رضی اللہ عنہ کو خبر تحقیق کے لیے بھیجا جب تحقیق ہو گئی تو آپ ﷺ نہایت جلدی میں نکلے اور منافقین جو پہلے غزوات میں ساتھ نہیں جاتے تھے وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ راستہ میں ایک جاسوس ملا جس کو کفار نے مخبری کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کیا اور حضور ﷺ کی اجازت سے اسے قتل کر دیا۔ جب کفار کو جاسوس کے قتل کی خبر ملی تو کفار پر رعب پڑ گیا اور تمام قبائل منتشر ہو گئے۔ حارث کے ساتھ صرف اس کے قبیلہ کی آدمی ہی رہ گئے۔ حضور ﷺ وہاں پہنچے تو مریسیع کے مقام پر ٹھہرے اور پہلے حملہ میں کفار کو شکست دی۔ مسلمانوں کو اس غزوۂ میں بہت سامال غنیمت ملا مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس غزوۂ میں شہید نہ ہوا۔ اور اسی غزوۂ میں افک کا واقعہ پیش آیا۔[۲]

اس غزوہ میں بھی آپ ﷺ کو اطلاع ملی تھی کہ مشرکین عرب قبائل سے مل کر جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے پیش قدمی فرمائی جس سے کفار پر رعب طاری ہو گیا ان کے سب حریف بھاگ گئے۔ صرف ایک قبیلہ بچ گیا۔ آپ ﷺ نے ان کو شکست دی۔ یعنی کہ حملہ میں پہل کرنے سے ان پر رعب طاری ہو گیا اور ان لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

غزوۂ خندق:

اسے غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں یہ سن ۵ھ میں پیش آیا۔ یہ ابن اسحاق اور جمہور علماء کا قول ہے۔ اور صحیح بھی یہی ہے۔[۳] ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ سن چار ہجری میں پیش آیا یہ قول موسی بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا ہے جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔[۴]

اس غزوۂ میں بچوں کی حفاظت کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خندق کھودا تھا، اس لیے اس کو غزوۂ خندق کہتے ہیں

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۷

۲۔ امام بخاری نے اس اختلاف کو ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ غزوہ بنی المصطلق سن ۶ھ میں ہوا۔ اور موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ سن ۴ھ میں ہوا۔ ابن قیم لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق سن ۶ھ میں خندق کے بعد لکھتے ہیں اور یہی قول جمہور کا ہے۔ علامہ واقدی اور اہل سیر کا اجماع ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق میں زخمی ہوئے اور اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ علامہ واقدی کہتے ہیں کہ بنی المصطلق میں سن ۵ھ میں ہوا۔ (ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۳/۲۹۵)

۳۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۳/۳۰۲

۴۔ عسقلانی، احمد بن علی بن حجر، فتح الباری شرح صحیح البخاری، (مکتبہ السلفیہ، القاہرۃ، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۵ء) ص:۷/۳۷۵

اور چونکہ بہت سے قبائل متفق ہو کر اس دفعہ مسلمانوں کو فنا کرنے آئے تھے اس لیے اس کو غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں۔[1]

سبب:

کیونکہ یہود بنو نضیر کو حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ سے نکال دیا تھا اس لیے یہود مختلف علاقوں میں منتشر ہوگئے اور جب ان کو خبر ملی کہ غزوۂ احد میں قریش کو غلبہ ہوا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ابو سفیان نے دوبارہ جنگ کی دھمکی دی ہے تو بنو نضیر کا ایک وفد قریش کے پاس مکہ گیا اور انہوں نے قریش مکہ کو آپ کے خلاف جنگ کے لیے اکسایا اور کہا کہ "ہم تمہارے ساتھ مل کر اسے جڑ سے اکھاڑ دیں گے "اور جب تک محمد ﷺ کا خاتمہ نہ کر لیں تمہارے ساتھ رہیں گے قریش مکہ ان کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے اس کے بعد یہودی بنی غطفان کے پاس گئے اور انہیں جنگ کے لئے تیار کیا اور پھر مختلف قبائل کے پاس گئے اور جہاں تک ممکن ہو سکا سب کو تیار کیا۔[2]

الغرض اس دفعہ کفار قریش چار ہزار آدمیوں کا لشکر لے کر نکلے ان کا سردار ابو سفیان تھا ان کے ساتھ ۳ تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے اور قریش راستے میں بہت سارے قبائل کو اپنے ساتھ ملاتے گئے۔ اس طرح جب یہ لوگ غزوۂ خندق پہنچے تو ان کی تعداد دس ہزار تھی۔[3]

جنگ کی تیاری:

جب نبی کریم ﷺ کو یہ خبر ملی کہ ابو سفیان اپنا کثیر لشکر لے کر مکہ سے نکل چکا ہے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا جس پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو خندق کھودنے کا مشورہ دیا۔ آپ ﷺ کو ان کا یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اور پھر جلدی کے ساتھ خندق کھودنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ مدینہ سے آگے یہ خندق کھودی گئی اس طرح کہ سلع اور خندق کے درمیان میں مسلمانوں کا قیام ہو سکے اس خندق کو کھودنے کے لیے مسلمانوں نے بڑی محنت کی۔[4]

جنگ کے لیے روانگی:

نبی کریم ﷺ نے یہ انتظام کیا کہ عورتوں اور بچوں کو مدینہ کے نسبتاً محفوظ اور بلند مقام میں جمع کر دیا۔ اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا خلیفہ مقرر کیا اس کے بعد تین ہزار مہاجرین و انصار کے ساتھ آپ ﷺ مدینہ سے آگے کوہ سلع

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۲۲

۲۔ ایضاً، ص:۲۲۳

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

کے دامن میں ٹھہرے۔ آپ ﷺ کے سامنے خندق تھی اور سلع پشت کی جانب تھا۔ [۱]

بغیر جنگ کے مشرکین کی شکست:

ایک مہینہ سے کچھ کم عرصہ تک کفار کا محاصرہ رہا خندق کی وجہ سے بالمقابلہ جنگ نہ ہو سکی مگر تیروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ سے بچا لیا اور مشرکین کی فوجوں کو دو ذرائع سے شکست دی۔ اس کا پہلا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ غطفان کے ایک سردار نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دوران جنگ اسلام قبول کر لیا اور جنگی حکمت عملی کے طور پر کفار کے قبائل میں جا کر ان کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کا اتحاد ختم ہو گیا۔ [۲]

دوسرا سبب یہ ہوا اللہ کی غیبی مدد سے ایک رات سخت طوفان آیا کفار قریش کے تمام خیمے اکھڑ گئے، تنابیں ٹوٹ گئیں، برتن بکھر گئے اور ان کے چولہے بجھ گئے۔ اور سخت سردی کا موسم تھا جو اس صورتحال میں قابل برداشت نہ رہا۔ ابوسفیان نے قریش سے کہا کہ اب ہم مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتے اس طرح تمام قبائل جو متفقہ طور پر اسلام اور رسول اللہ ﷺ کو ختم کر دینے کے لیے جمع ہوئے تھے شدید شکست اور پریشانی کے عالم میں واپس ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بغیر جنگ کے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا۔ [۳]

غزوۂ احزاب یعنی غزوۂ خندق اسلامی تاریخ کا وہ پہلا غزوہ ہے جس میں خندقیں کھودی گئیں۔ یہ ایک جنگی حکمت عملی تھی جس کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے"۔ [۴] اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مل جل کر خندق کھودنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرہ امتیازات سے بالاتر ہو کر مساوات کا درس دیتا ہے۔

- آپ ﷺ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر خندق کھودنا آپ ﷺ کی صحابہ کے ساتھ محبت کی دلیل ہے۔
- اس غزوۂ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنگی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ ثابت قدمی، صبر و استقلال اور دعاء و مناجات بھی فتح اور کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔

خندق کے بعد کے غزوات

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ غزوۂ خندق ذی القعدہ ۵ ہجری میں ہوا۔ [۵] لیکن موسیٰ بن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سن ۴ھ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۲۴

۲۔ ایضاً، ص: ۲۲۷

۳۔ ایضاً، ص: ۲۳۰

۴۔ البوطی، فقہ السیرۃ النبویہ، ص: ۴۰۳

۵۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص: ۱/ ۲۹۷

میں غزوہ خندق ہوا اور ابن حزم کہتے ہیں کہ یہی درست ہے۔ اس لئے کہ صحیحین کی روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر احد کے وقت ۱۴ برس کے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دی لیکن خندق کے وقت ۱۵ برس کے تھے تو اجازت دے دی گئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ استدلال درست نہیں۔ اس لیے کہ اگر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس وقت ۱۴ برس، ۱۱ مہینہ کے ہوں تو یہ کہنا درست ہو گا کہ خندق کے وقت ۱۵ برس کے تھے۔ یہاں مہینوں کا ذکر نہ کرنا اس کو کمزور بنا دیتا ہے۔ اور درست یہی ہے کہ سن ۵ھ میں غزوۂ خندق ہوا۔[۱]

غزوۂ خندق کے بعد قریش مکہ کی ہمتیں پست ہو گئیں اس کے بعد کفار قریش مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قریش اب کبھی ہم پر حملہ نہ کریں گے بلکہ ہم ان پر حملہ کریں گے اور یہی ہوا آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صبح کے وقت مدینہ پہنچے، رسول اللہ ﷺ نے اپنا اسلحہ اتارا ہی تھا کہ چند ہی لمحے بعد اللہ کی طرف سے دوبارہ غزوہ پر جانے کا حکم ہوا۔ لہٰذا آپ ﷺ غزوہ کے لیے نکل پڑے۔ اس طرح غزوۂ خندق کے بعد فوراً غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

- **غزوۂ بنی قُریظہ:** اسی سال ۵ھ میں غزوۂ خندق کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ گئے، رسول اللہ ﷺ اپنا اسلحہ اتار چکے تھے۔ اور آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں غسل فرما رہے تھے ابھی آپ ﷺ ایک ہی طرف بدن دھو پائے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور حکم ہوا کہ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ آپ ﷺ فوراً بنی قریظہ کی طرف تشریف لے گئے اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ آخر کار رسول اللہ ﷺ کے حکم پر یہودی بلا کسی شرط کے نیچے اتر آئے اور گرفتاری دے دی۔ قبیلہ اوس بنی قریظہ کی جان بخشی کی سفارش لے کر آپ ﷺ پاس آئے آپ ﷺ نے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو کہ قبیلہ اوس کے سردار تھے کو بنی قریظہ کے بارے میں فیصلے کا اختیار دے دیا۔ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کے مردوں کو قتل اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنانے کا حکم دیا اس غزوۂ میں مسلمانوں کو بہت سامال غنیمت حاصل ہوا۔[۲]

اس غزوہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ چاہے کتنے بھی تھک چکے ہوں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے تو آپ کو سر تسلیم خم کرتے ہوئے اللہ کے حکم پر چل پڑنا چاہیے دیر نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ حضور ﷺ نے ابھی اپنا پورا بدن بھی نہ دھویا تھا اور اللہ کا حکم آ گیا تو آپ ﷺ نے سب کام چھوڑ کر دوبارہ اللہ کے حکم کے لیے کمر کس لی اور بنو قریظہ کی طرف نکل پڑے۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۲۱

۲۔ ایضاً، ص: ۲۳۱

➢ **غزوۂ بنی لحیان:** غزوہ بنی قریظہ کے چھٹے مہینے مدینہ میں ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو سو مہاجرین و انصار کو لے کر بنی لحیان [1] کے ارادہ سے نکلے۔ اصحاب رجیع (حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہما) کے ساتھ جو سلوک بنی لحیان نے کیا تھا اس غزوہ کا مقصد بنی لحیان کو اس کی سزا دینا تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچنے کی خبر بنی لحیان کو ملی تو وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ دو روز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہرے رہے کوئی نظر نہ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر سرایا بھی بھیجے مگر کوئی نہ ملا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ آ گئے۔ اس سفر میں چودہ روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر رہے واللہ اعلم۔ [2]

اس غزوہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لینا حکومت وقت پر لازم ہوتا ہے تاکہ کوئی دشمن بھی دوبارہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کی کوشش نہ کرے یعنی کہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ظالم کو ہرگز معاف نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب رجیع پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لینے کے لئے بنی لحیان کی طرف پیش قدمی فرمائی۔

اقدامی غزوات:

اس کے بعد اقدامی غزوات کا آغاز ہو جاتا ہے اور غزوۂ خیبر سب سے پہلا اقدامی غزوہ ہے۔

غزوۂ خیبر:

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق کہتے ہیں خیبر کی طرف روانگی سات ہجری میں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے لوٹ کر ذوالحجہ میں مدینہ آئے۔ کچھ دن مدینہ میں رہے پھر محرم میں خیبر کی طرف روانہ ہو گئے۔ [3] خیبر ایک بڑا شہر تھا جس میں بہت سے قلعے اور کھیت تھے۔ یہ مدینہ کے شمال میں شام کی سمت سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ غزوۂ خیبر وہ پہلا غزوۂ ہے جس میں جنگ کی ابتدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ جب کہ ان لوگوں کی جانب سے مسلمانوں سے جنگ و قتال کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ [4]

روانگی:

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے لوٹ کر مدینہ آئے تو بیس دن یا اس کے قریب مدینہ میں

۱۔ لحیان اس قبیلہ کے جد امجد کا نام بن ھذیل بن مدرکہ ہے۔ ان کی رہائش مکہ اور مدینہ کے درمیان مکہ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ (ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۱۶۶)

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۳۲-۲۳۳

۳۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۳/۳۳۰

۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۶۱

رہے اس کے بعد غزوۂ خیبر کے ارادے سے نکلے۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں سباع بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ حضور ﷺ کے ساتھ اس غزوۂ میں چودہ سو جنگجو تھے۔ اس میں کچھ شاہ سوار اور زیادہ تر پیادہ تھے۔ دو سو گھوڑے اور اونٹ بہت زیادہ تھے۔ اس غزوۂ میں حضور ﷺ نے بنی غفار کی چند عورتوں کو مریضوں کی خدمت کے لئے ساتھ لیا۔ الغرض آپ ﷺ مقام الصہباء میں پہنچے جو خیبر کا قریبی علاقہ ہے۔ شام کا وقت تھا اور قاعدہ یہ تھا کہ حضور ﷺ رات کو کسی قوم پر حملہ نہیں کرتے تھے اس لیے صبح کی نماز تاریکی میں پڑھی گئی اور حملے کے لیے تیار ہو گئے۔[1]

سبب :

غزوۂ خیبر کا واحد سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو اسلام کی دعوت دی جاچکی تھی۔ یہ پرامن دعوت بہت لمبی مدت دلائل اور براہین پر قائم رہی۔ لیکن یہود اپنے کفر پر جمے رہے۔ انہوں نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اسلام کو یعنی حق کو قبول نہیں کیا اور ان کے سینوں میں اسلام کے خلاف بغض اور نفرت بھری ہوئی تھی اس لئے ان سے جنگ کی گئی۔ خیبر پہنچے تو آپ نے پہلی رات بہت خاموشی سے گزاری، صبح تک انتظار کیا جب اذان نہیں سنائی دی تو آپ نے حملہ کر دیا۔[2]

غزوۂ خیبر وہ پہلا غزوہ ہے جس کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے کی گئی یعنی کہ یہ غزوہ پہلا اقدامی غزوہ ہے۔ اس غزوہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو ان پر اچانک حملہ کر دینا بھی درست ہے۔ اور مال غنیمت کی تقسیم کی پالیسی بھی اسی غزوہ میں بنائی گئی۔

- حبشہ سے واپس آنے والوں کو مال غنیمت میں شریک کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ میں شرکت نہ کرنے والوں کو مال غنیمت میں شریک کرنا جائز ہے۔
- حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا معانقہ کرنا اور بوسہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ دور سے آنے والے کو معانقہ کرنا اور بوسہ دینا جائز ہے۔[3]

فتح مکہ :

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو قبیلہ قریش کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے کرے اور جو قبیلہ محمد ﷺ کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے کرے۔ اسی بنا پر بنی بکر نے وہیں قریش سے معاہدہ کیا اور بنی خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بنی بکر نے ہدنہ کے ایام کو غنیمت سمجھ کر بنی خزاعہ سے بدلہ لینا چاہا، اور یہ سب بنی الدیل نے کیا۔ بنی الدیل کا سردار نوفل بن معاویہ الدیلی بنی الدیل کو لے کر بنی خزاعہ پر حملہ آور ہوا۔ اس میں سردارانِ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۶۳

۲۔ البوطی، فقہ السیرہ النبویہ، ص:۴۵۷

۳۔ ایضاً، ص:۴۶۱-۴۶۲

قریش نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور بنو خزاعہ پر خوب ظلم کیا۔ اس وجہ سے عملاً قریش نے حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑ دیا۔ کیونکہ بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے معاہد تھے۔ اس لیے عمر بن سالم خزاعی نے مدینہ آکر رسول اللہ ﷺ سے مدد چاہی اور یہی وجہ فتح مکہ کا سبب بنا۔

الغرض رسول اللہ ﷺ دس رمضان ۸ ہجری کو دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے اور بغیر لڑائی کے مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ لہذا چھوٹے موٹے واقعات کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہ ہوئی۔ اور مال غنیمت کے لحاظ سے بھی یہ مہم بالکل خالی تھی۔ لیکن یہ اسلام کی ایک عظیم الشان فتح تھی۔[1]

اس غزوہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دشمن عہد شکنی کرے اور صلح پر قائم نہ رہے تو مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ ان پر اچانک حملہ کر دے، اس پر ان کو آگاہ کر کے جنگ کا آغاز کرنا ضروری نہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے لئے تدبیر اختیار فرمائی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اگر کسی قوم کے بعض افراد بدعہدی کریں اور بقیہ لوگ اس کی مذمت نہ کریں اور ان کی طرف سے اس سے نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہو تو اسے پوری قوم کی بدعہدی سمجھی جائے گی جیسا کہ قریش کے بعض لوگوں نے مسلمانوں کے حلیفوں بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور باقی ان کے سرداران اس بات پر خاموش رہے، ان کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اس بدعہدی پر راضی ہیں۔ اس لیے بعض افراد کی بدعہدی کو تمام قریش کی بدعہدی سمجھا گیا۔ اور فتح مکہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہر غزوہ میں مال غنیمت کا حصول مراد نہیں ہوتا کیونکہ فتح مکہ کی مہم مال غنیمت کے لحاظ سے خالی تھی۔

فتح مکہ کے بعد کے غزوات:

۲۰ رمضان ۸ ہجری کو حضور ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور اسی روز مکہ فتح ہوا۔ اس کے بعد رمضان کا بقیہ مہینہ اور چند روز شوال کے آپ مکہ میں ٹھہرے، اور اس کے بعد آپ نے مکہ سے ہی دوبارہ غزوات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

غزوۂ حنین:

صاحب اصح السیر ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ غزوہ حنین شوال ۸ ہجری میں پیش آیا۔[2] حنین اور اوطاس مکہ اور طائف کے درمیان دو مقام ہیں۔ یہ غزوۂ ان دونوں مقامات کی طرف منسوب ہے اور اس کو غزوہ ہوازن بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اس میں ہوازن سے مقابلہ ہوا تھا۔[3]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۱۸-۳۱۹

۲۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۱/ ۳۶۴ (حنین ایک وادی ہے اس کے اور مکہ کے درمیان تین رات کا فاصلہ ہے)

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۴۸

سبب :

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں اس غزوۂ کا سبب یہ تھا کہ جب اللہ تعالی کی تائید و نصرت سے مکہ فتح ہوا جس میں قریش نے اپنی بغاوت اور سرکشی کے بعد سر تسلیم خم کر دیا۔ تو قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف کے اشراف اکٹھے ہوئے اور انہوں نے قبیلہ ہوازن کے سردار مالک بن عوف کی سربراہی میں بڑی جماعت اکٹھی کی۔ مالک بن عوف کے حکم سے وہ اپنے ساتھ سارا مال، عورتیں اور بچے بھی لائے اور مقام اوطاس میں پڑاؤ ڈالا۔[۱]

روانگی :

حضور ﷺ کو جب ہوازن کے ارادہ کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے عبد اللہ بن ابی حدرد الاسلمی رضی اللہ عنہ کو تحقیق کے لیے بھیجا۔ انہوں نے جب آ کر خبر کی تصدیق کی تو حضور ﷺ نے ان کے مقابلہ کے لیے جانے کا ارادہ کیا۔ اور جب معلوم ہوا کہ صفوان بن امیہ کے پاس اسلحہ اور آلات حرب بہت زیادہ ہیں تو آپ ﷺ نے عاریتاً صفوان بن امیہ سے سو(۱۰۰) درع اور اس کے موافق دوسرا اسلحہ لے لیا۔ اس انتظام کے بعد حضور ﷺ دو ہزار مکی صحابہ رضی اللہ عنہم اور دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو مدینہ سے آئے تھے سب کو ساتھ ملا کر بارہ ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے اور عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ میں امیر بنا دیا۔[۲]

حملہ :

مشرکین کے سردار مالک بن عوف کو جب حضور ﷺ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے دستوں کو وادی حنین میں تعینات کر دیا۔ مسلمان جب وادی حنین میں پہنچے تو اس وقت ابتدائے صبح تھی مسلمانوں نے جیسے ہی نشیب کی طرف اترنا شروع کیا تو اچانک وادی کی گھاٹیوں اور تنگ راستوں سے مشرکین کے فوجی دستے نمودار ہونا شروع ہو گئے اور انہوں نے اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمان منتشر ہو گئے۔ جب مسلمانوں اور کفار میں جنگ ہوئی اور مسلمان پیٹھ کر کے کر بھاگنے لگے تو حضور ﷺ نے اپنے خچر کو کفار کی جانب بھگانا شروع کر دیا اور اسی اثناء میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو پکارا تو مسلمان لبیک لبیک کرتے ہوئے واپس لوٹے اور جنگ کرنے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب زور کا رن پڑا ہے پھر آپ ﷺ نے کچھ کنکریاں لے کر کفار کی جانب پھینکیں۔ اور فرمایا" مجھے محمد کے رب کی قسم یہ شکست کھا کر رہیں گے " اللہ نے مشرکین کے دلوں میں رعب ڈالا اور انہیں شکست ہوئی اور ان پر اتنی بدحواسی طاری ہوئی کہ کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔[۳]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۵۰

۲۔ ایضاً، ص:۳۵۱

۳۔ ایضاً، ص:۳۵۲

غزوۂ بدر کی طرح اس غزوہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دشمنوں کی کثرت کے مقابلے میں ان کی قلت انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی اگر وہ صبر و استقامت اور تقویٰ اختیار کریں اور اس کے برعکس غزوۂ حنین سے مسلمانوں کو یہ سبق ملا کہ کثرت تعداد سے بھی انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا اگر وہ صابر اور متقی نہ ہوں۔

- اس غزوۂ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدین کے علاج و معالجہ کی غرض سے عورتوں کا غزوۂ میں شریک ہونا جائز ہے۔
- حضور ﷺ کا حضرت عبد اللہ بن ابی حدرد الاسلمی رضی اللہ عنہ کو دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ضرورت ہو تو دشمن کی مخبری کرنا بھی جائز ہے۔
- حضور ﷺ کا صفوان بن امیہ سے عاریۃً اسلحہ لینا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ضرورت ہو تو مشرکین سے عاریۃً اسلحہ لینا بھی جائز ہے دشمنوں سے جنگ کے لیے۔

غزوۂ طائف:

غزوۂ طائف شوال ۸ ہجری میں ہوا۔ صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ ہوازن اور ثقیف کی ایک جماعت غزوۂ حنین سے بھاگ کر طائف چلی گئی تھی۔ اور ان میں ان کا سردار مالک بن عوف النظری بھی تھا۔ اس لیے خود رسول اللہ ﷺ فوج کے ساتھ حنین سے سیدھا طائف کی طرف گئے۔ اللہ کی طرف سے طائف کی فتح کی اجازت نہ ملی اور رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔[۱]

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ آپ ﷺ غزوہ کے لیے نکل چکے ہوں پھر بھی جب اللہ کی طرف سے اجازت نہ ملے تو آپ ﷺ راستے سے واپس تشریف لے آئیں۔ اس کے برعکس جیسا کہ غزوۂ خندق کے فوراً بعد اللہ کے حکم کی وجہ سے آپ ﷺ بنو قریظہ کے ساتھ جنگ کے لئے تشریف لے گئے یعنی کہ ہر حال میں نبی کے لیے بطریق اولیٰ اور عام آدمی کے لیے بھی اللہ کی اطاعت لازم ہے۔

غزوۂ تبوک و جیش العُسرۃ:

مدارج النبوت میں ہے کہ تبوک ایک مقام ہے جو مدینہ سے چودہ مرحلہ (منزل: مرحلہ، ایک دن کا سفر، وہ سفر جو ایک دن میں اوسطاً طے کیا جائے (تقریباً ۴۸ میل کی مسافت) نیز اتنا فاصلہ) پر شام اور مدینہ کے درمیان ہے۔[۲] بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک قلعہ کا نام ہے۔ جبکہ صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تبوک ایک چشمہ کا نام ہے۔[۳]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۵۸

۲۔ دہلوی، مدارج النبوت، ص: ۲/ ۴۸۲

۳۔ مسلم، صحیح مسلم، ابو الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری، (مکتبہ، دار الجلیل، بیروت، لبنان) کتاب: انبیاء کرام علیہم السلام کے فضائل کا بیان، باب: نبیٔ کریم ﷺ کے معجزات، حدیث: ۵۹۴۷

ابن سعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ شام میں رومیوں نے بڑی فوج جمع کی ہے، اور ہرقل نے ایک سال کا خرچہ اپنے لوگوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور ان کے ساتھ لخم وجذام اور عاملہ وغسان کے آدمی بھی آکر شامل ہو گئے ہیں۔ اور ان کی فوج کے مقامات عرض بلقاء تک آ گئے ہیں۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو تیاری کا حکم دیا۔ وہ مقام بتایا جس کا آپ ﷺ ارادہ رکھتے تھے تاکہ لوگ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں اور اغنیاء کو فی سبیل اللہ نفقہ اور سواری مہیا کرنے کی ترغیب دی۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی اپنی استطاعت کے موافق اونٹ اور مال لائے۔ یہ وہ غزوہ تھا جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال لاکر حاضر کیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا کل مال لاکر حاضر کر دیا اور خدا اور اس کے رسول کا نام اپنے اہل وعیال کے لیے باقی رکھا۔ الغرض جس قدر اموال جمع ہوئے حضور ﷺ نے اس کو فوج پر تقسیم کیا۔ بہر حال یہ غزوۂ سخت قحط کے ایام میں ہوا تھا۔ دور کا سفر تھا، سخت گرمی کا موسم تھا، سواری کی قلّت تھی، کھانے پینے کی اشیاء کی کمی اور لشکر کی تعداد بہت زیادہ الغرض اس غزوۂ میں مسلمانوں کو بڑی تنگی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو جیش العسرۃ بھی کہتے ہیں اس غزوۂ کے لیے حضور ﷺ رجب کے مہینہ ۹ ہجری میں جمعرات کے روز روانہ ہوئے۔ اس غزوۂ میں جنگ نہ ہوئی اور مسلمان خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے۔ [2]

اس غزوہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان جس حال میں بھی ہوں، تنگی ہو سخت پریشانی ہو یعنی کہ خوراک کے لحاظ سے اور موسم کے لحاظ سے سخت پریشانی کے عالم میں ہوں تب بھی اگر حضور ﷺ کا حکم آجائے تو رکنا جائز نہیں، نکلنا لازم ہے۔ یعنی کہ جب حکومت وقت کی طرف سے یا امیر المومنین کی طرف سے اعلان ہو جائے تو ہر حال میں جنگ کے لیے نکلنا لازم ہو جاتا ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے راستے میں اغنیاء کو بڑھ چڑھ کر اپنا مال خرچ کرنا چاہیے جیسا کہ اس غزوہ میں حضور ﷺ نے جب اعلان کیا تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنا کل مال بعض نے اپنا آدھا مال حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

خلاصہ بحث:

اصح قول کے مطابق غزوات کی ۲۷ ہے۔ اور غزوات کو ترتیب زمانی کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس فصل میں غزوات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہر ایک غزوہ کا سبب بیان کیا گیا ہے اور ہر ایک غزوہ کا تجزیہ و تحلیل بھی کیا گیا ہے۔ اور جس غزوہ میں دروس و نصائح کا اخذ ممکن تھا اس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

۱۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ج:۱، ص:۳۷۲

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۸۶

۲۔ سرایا کا تعارف

سریۂ کا لغوی و اصطلاحی معنٰی:

سریۂ کا لغوی معنٰی بیان کرتے ہوئے علامہ ابن منظور لکھتے ہیں۔

"سير الليل عامعه"[۱]

امام راغب اصفہانی نے بھی اسریٰ کے معنی سیر اللیل (رات کی سیر) کے الفاظ سے کئے ہیں۔[۲]

قرآن کریم میں اسریٰ کا لفظ چھے مقامات پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا مفہوم رات کا سفر یا رات کی سیر ہی ہے۔ سریۂ اور اسریٰ کا مادہ ایک ہی ہے اور دونوں کے بنیادی مفہوم میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

چنانچہ علامہ ابن منظور سریۂ کے اصطلاحی معنی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سریۂ کم از کم پانچ افراد اور زیادہ سے زیادہ تین سو افراد پر مشتمل لشکر کو کہتے ہیں لیکن بہتر سریۂ چار سو افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ پورے لشکر کا ایک حصہ ہوتا ہے اور یہ رات کو سفر کرتا ہے۔ تاکہ دشمن پر نظر رکھ سکے اور دشمن اس سے ہوشیار نہ ہو جائے سریہ لشکر کے بہترین افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور عموماً یہ تمام افراد سوار ہوتے ہیں۔ سریۂ میں لشکر کا قائد ساتھ نہیں جاتا۔"[۳]

محمد علی تھانوی لکھتے ہیں کہ:

"سریا جیش (لشکر) کا حصہ ہوتا ہے۔ سریۂ زیادہ سے زیادہ چار سو افراد مشتمل ہوتا ہے اور جیش (لشکر) چار ہزار افراد پر مشتمل ہوتا ہے"[۴]

سریۂ کی ان تعریفوں پر غور کرنے سے سریۂ کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں ان کو حسب ذیل ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

- سریۂ لشکر کا ایک خاص حصہ ہوتا ہے۔
- سریۂ لشکر کے بہترین افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔
- سریۂ میں شامل عموماً تمام افراد سوار ہوتے ہیں۔
- سریۂ زیادہ سے زیادہ چار سو افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ ابن منظور، لسان العرب، ص:۲/۲۰۰۳

۲۔ اصفہانی، اَبو القاسم حسین بن محمد راغب، مفردات فی غریب القرآن، (ناشر، دار القلم، الدار الشامیہ، دمشق، بیروت، طبع اولیٰ، ۱۴۱۲ھ) ص:۲۳۱

۳۔ ابن منظور، لسان العرب، ص:۲/۲۰۰۴

۴۔ تھانوی، علامہ محمد علی تھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، (طبع اولیٰ، ۱۹۹۶ء مکتبہ لبنان، بیروت، لبنان) ص:۱/۲۳۰

- سریہ دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے اور پھر لشکر کے قائد کو اس کی اطلاع کرنے پر مامور ہوتا ہے۔
- سریہ رات کو سفر کرتا ہے تاکہ دشمن کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔
- سربراہ لشکر یا سربراہ فوج سریہ کے ساتھ نہیں جاتا۔

سرایا کا تعارف:

زمانہ نبوّت میں کتنے سرایا وقوع پذیر ہوئے، ان کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد بن اسحاق نے ۳۶،[۱] ابن سعد نے ۴۰،[۲] علامہ واقدی نے ۴۸،[۳] کی تعداد بیان کی ہے۔ صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ ان تمام اقوال میں علامہ واقدی کا قول زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اور سیرت و تاریخ اور کتب احادیث سے بھی یہی تعداد صحیح تر محسوس ہوتی ہے۔

صاحب اصح السیر ان حضرات کے حوالے سے لکھتے ہیں بعض سرایا کا ذکر واقدی نے کیا ہے۔ اور ان کا ذکر "مواہب لدنیہ، معارج النبوت، مدارج النبوہ" وغیرہ میں بھی ہے مگر ان سرایا کی ترتیب میں بہت اختلاف ہے۔ ان میں زمانہ کی تعیین کرنا بہت مشکل ہے۔ ان سرایا کا ذکر احادیث صحیحہ میں بھی موجود ہے مگر ان میں بھی تاریخ مذکور نہیں ہے۔[۴]

مقالہ ھٰذا میں صرف انہی سرایا کے اسباب پر تبصرہ کریں گے جو فقہ السیرۃ کے حوالے سے بہت اہم ہیں، کیونکہ تمام سرایا کا احاطہ کرنا مشکل ہو جائے گا لہٰذا تفصیلی مطالعہ کے لیے کتاب اصح السیر کا مطالعہ فرمائیں۔

سریہ حمزہ رضی اللہ عنہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کے ارادہ سے رمضان کے شروع میں یعنی ہجرت کے چھ ماہ بعد ساتویں مہینہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے لئے پہلا پہلا علم درست فرمایا۔ یہ علم سفید تھا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت ابو مرثد الغنوی رضی اللہ عنہ علم بردار تھے۔ اس علم کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے تیس حضرات کو قریش کے جماعت کے مقابلہ میں بھیجا۔ جو شام سے واپس آرہے تھے جس میں تین سو کفار قریش ابو جہل کے ماتحت شریک تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سیف البحر (ساحل سمندر) تک پہنچے (جو مقام عیص کے قریب ہے) اور کفار سے بھی ملے۔ اس لیے اسے سیف البحر بھی کہتے ہیں۔ قتال کے لیے صفیں درست ہو گئی تھیں۔ مگر ایک شخص (مجدی بن عامر الجہنی) نے جو فریقین کا حلیف تھا بیچ میں پڑ کر

۱۔ العسقلانی، فتح الباری، ص:۷/۲۸۱

۲۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۱/۲۴۶

۳۔ واقدی، کتاب المغازی، محمد بن عمر بن واقدی، (مکتبہ، دارالاعلمی، بیروت، طبع ثالثہ، ۱۴۰۹ھ، ۱۹۸۹ء) ص:۱/۹

۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۷-۲۳۸-۲۳

لڑائی موقوف کرادی۔[1]

اس سریۂ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آخری وقت تک صلح کی کوشش کرنی چاہیے۔یعنی کہ اگر صفیں درست ہو جائیں لڑائی کے لیے پوری تیاری ہو چکی ہو تو بھی صلح کو ترجیح دینی چاہیے اور لڑائی کو مؤخر کر دینا چاہیے۔

سریۂ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ:

سریۂ حمزہ کے بعد شروع شوال میں ہجرت کے آٹھویں مہینہ میں ساٹھ (٦٠) یا اسی (٨٠) مہاجر کے خاص سواروں کو حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کے ماتحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رابغ[2] بھیجا۔ان لوگوں کے لئے جو علم تیار کیا گیا وہ بھی سفید تھا اور اس علَم کے علمبردار مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ تھے۔یہ لوگ جب پہنچے تو وہاں دو سو قریش جو ابو سفیان بن حرب اور عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ جمع تھے۔یہاں بھی کوئی لڑائی نہ ہوئی۔لیکن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کفار پر تیر پھینکا اور یہ پہلا تیر تھا جو مسلمانوں کی طرف سے کفار پر پھینکا گیا تھا۔دو مسلمان مقداد بن عمر البہرانی[3] اور عتبہ بن غزوان المازنی رضی اللہ عنہما[4] بھی کفار کے ساتھ تھے وہ اسی روز بھاگ کر مسلمانوں سے جا ملے۔[5]

سریۂ سیف البحر، سریۂ عبیدہ بن الحارث کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے کی ان میں سے اسلام کا پہلا سریہ کونسا ہے۔اس میں تطبیق دیتے ہوئے صاحب اصح السیر ابن اسحاق کے حوالے سے لکھتے ہیں[6] کہ ان دونوں سریہ کی اوّلیت میں روایات مختلف ہیں۔مگر غالب رائے یہ ہے کہ سریۂ حمزہ اور سریہ عبیدہ بن الحارث دونوں ایک ہی وقت بھیجے گئے۔

سریۂ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ:

اس کے بعد ہجرت کے نویں مہینہ ذی قعدہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بیس سواروں

١۔ داناپوری، اصح السیر، ص:١٥٨

٢۔ جحفہ کے قریب مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک گاؤں کا نام ہے، یہ جحفہ مدینہ کی جانب سات یا آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔اسے رابق بھی کہتے ہیں۔(ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:١٧٨)

٣۔ مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کے متعلق ابن سعد لکھتے ہیں کہ ان کی نسبت "بہرانی" ہے، بہراء بن عمرو رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت ہے۔انہیں کو کندی بھی کہتے ہیں چونکہ بنی کندہ کے حلیف تھے۔اور انہی کو مقداد بن الاسود کبھی کہتے ہیں اس لیے کندہ سے بھاگ کر مکہ آئے تو اسود بن عبد یغوث نے ان کو متبنیٰ کیا تھا۔اور یہ قدیم الاسلام تھے۔(ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:٢٤٦)

٤۔ عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ یہ بہت پہلے اسلام لے آئے تھے، انہوں نے خود بصرہ میں خطبہ کے اندر بیان کیا کہ ہم ساتویں نمبر کے مسلمان ہیں۔چالیس برس کی عمر تھی جب حبشہ گئے۔پھر مقداد کے ساتھ مدینہ آئے۔انہوں نے بصرہ کو بصرہ بنایا اور بصرہ میں مسجد بنائی، اور بعد میں یہ بصرہ کے امیر بن گئے تھے۔(داناپوری، اصح السیر، ص:١٥٩)

٥۔ داناپوری، اصح السیر، ص:١٥٩

٦۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:١/٢٤٦

کے ہمراہ قریش کی ایک جماعت کو روکنے کے لئے خزار بھیجا۔ اور کہا کہ خزار کے آگے نہ جانا۔ ان کے لیے بھی جو علَم تیار کیا گیا وہ سفید تھا اور مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ یہ لوگ صرف رات کے وقت راستہ پر سفر کرتے تھے۔ اس طرح پانچویں دن صبح کے وقت خزار پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش کی جماعت ایک روز پہلے یہاں سے گزر چکی ہے۔ اور یہ لوگ وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ (۱)

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سپہ سالار کے حکم کی اطاعت کرنا جماعت پر لازم ہوتا ہے جیسا کہ اس سریہ میں حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خزار کے مقام سے آگے جانے کی اجازت نہیں فرمائی، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پورے پانچ دن کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کے حکم کے مطابق یہاں سے واپس لوٹ گئے، اس سے آگے نہیں گئے۔ کیونکہ اس سے آگے جانے کی حضور ﷺ نے اجازت نہیں دی تھی۔ یہ ہوتی ہے اطاعت امیر لہذا سپہ سالار کے حکم کی اطاعت کرنا جماعت پر لازم ہوتا ہے۔

سریۂ نجد:

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ اس کے بعد حضور ﷺ نے ایک قافلہ کو نجد بھیجا۔ وہ لوگ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنی حنیفہ کے ایک سردار ثمامہ بن اثال حنفی رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے حضور ﷺ کے پاس لے آئے۔ حضور ﷺ نے ان کو مسجد کے ستون سے بندھوا دیا۔ جب حضور ﷺ اس طرف گئے تو پوچھا کہ ثمامہ! کیا حال ہے؟ ثمامہ نے عرض کیا کہ اے محمد ﷺ! اگر آپ ﷺ قتل کریں گے تو ایک مستحق کو قتل کریں گے۔ اور اگر چھوڑ دیں گے تو ایک شکر گزار کو چھوڑ دیں گے اور اگر مال چاہتے ہیں تو بتاؤ مال آپ ﷺ کو دیا جائے گا۔ آپ ﷺ چلے گئے۔ دوسرے روز بھی یہی سوال جواب ہوا۔ اور پھر اسی طرح تیسرے روز بھی۔ حضور ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا۔ وہ وہاں سے ایک درخت کے پیچھے گئے اور غسل کیا۔ اور پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اور عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم جس قدر آپ ﷺ کے چہرے سے نفرت تھی اتنی کسی چیز سے نہ تھی۔ اور اب جتنی محبت آپ ﷺ کے چہرہ سے ہے اتنی کسی چہرے سے نہیں۔ اور کوئی دین میری نظر میں اتنا برا نہ تھا جتنا کہ آپ ﷺ کا دین۔ اور آج کوئی دین میری نظر میں اتنا محبوب نہیں ہے جتنا کہ آپ ﷺ کا دین۔ باقی قصّہ حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۲)

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۵۹

۲۔ (اور ثمامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں عمرہ کے لئے جا رہا تھا کہ آپ ﷺ کے لوگوں نے مجھے گرفتار کر لیا اگر آپ ﷺ اجازت دیں تو میں عمرہ کر لوں۔ حضور ﷺ نے بشارت دی اور عمرہ کا حکم دے دیا۔ جب یہ مکہ پہنچے تو قریش نے کہا کہ اے ثمامہ! تم صابی یعنی بے دین ہو گئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ نہیں میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اے اہل مکہ! اب تم کو ایک دانہ غلہ کا نہیں ملے گا جب تک رسول اللہ ﷺ اجازت نہیں دیں گے۔ چونکہ مکہ میں تمام غلّہ یمامہ سے ہی آیا کرتا تھا اس لیے اہلِ مکہ سخت پریشان ہو گئے۔ اور آخر کار حضور ﷺ سے قرابت کا واسطہ سے سفارش کی درخواست کی۔ حضور ﷺ نے سفارش کر دی تو غلّہ معمول کے مطابق آنے لگا۔ (داناپوری، اصح السیر ص:۲۳۳-۲۳۴)

اس سریہ میں جو واقعہ پیش آیا ہے ثمامہ بن اثال حنفی رضی اللہ عنہ کو گرفتار کرنے کا، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قیدی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ اس لیے کہ حسن سلوک سے متاثر ہو کر اکثر قیدی اسلام کی طرف آجاتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام لڑائی کے علاوہ حسن سلوک سے بھی پھیلا ہے۔

صلح حدیبیہ سے پہلے اور بعد کے سرایا

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ ان سرایا کا ذکر احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ مگر ان میں بھی تاریخ مذکور نہیں ہے۔ البتہ ان احادیث میں بعض شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیبیہ سے پہلے کے واقعات ہیں یا بعد کے۔ اصحاب سیر کی اتباع میں ان سرایا کو یہاں پر ذکر کر دیتے ہیں لیکن جن سرایا کو حدیبیہ کے بعد ہونا چاہیے اس کی وجوہات اس کی تفصیل کے ضمن میں بتادی جائیں گی۔ [1]

سریۂ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ بغمر:

عکاشہ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس آدمیوں کے ہمراہ بنی اسد کے مقابلہ کے لیے غمر بھیجا۔ ان میں ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ اور سباع بن وہب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ یہ لوگ جب قریب پہنچے تو بنی اسد اپنے مکانوں کو خالی چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہاں کوئی نہ ملا۔ مگر ایک شخص سے ان کے مویشی اور چراگاہ کا پتہ مل گیا۔ جہاں سے دو سو اونٹ ملے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کو مدینہ لے آئے۔ [2]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اگرچہ کفار کے ساتھ لڑائی کا معاملہ نہ بھی ہو تب بھی ان کا مال مسلمانوں پر حلال ہے جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سریہ میں ایک شخص نے مویشی اور چراگاہ کا پتہ بتایا تو وہاں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دو سو اونٹ مالِ غنیمت کے طور پر لے کر مدینہ پہنچے۔

سریۂ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بذی القُصہ:

یہ سریۂ ربیع الاول سن ۶ ہجری میں پیش آیا۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو دس آدمیوں کے ہمراہ بنی ثعلبہ کی طرف بھیجا۔ یہ لوگ ان کی جگہ ذی القصہ تک پہنچے۔ مگر وہ لوگ اپنی کمین گاہوں میں چھپ گئے۔ رات کے وقت جب صحابہ رضی اللہ عنہم بے خبر سو رہے تھے انہوں نے اچانک حملہ کر کے سب کو شہید کر دیا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی زخمی ہو گئے تھے۔ مگر کسی طرح وہ بچ گئے اور کوئی مسلمان ان کو پیٹھ پر لاد کر مدینہ لایا۔ [3]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۳۷-۲۳۸

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص:۲۳۸

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان جب بھی لڑائی کے لیے کسی مقام پر پہنچیں اور رات ہو جائے تو وہاں سب کے سب سو نہ جائیں بلکہ کچھ آرام کریں اور کچھ ان میں سے پہرہ دیں۔ جیسا کہ اس سریہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب سو گئے تو کفار نے موقع پا کر سب کو شہید کر دیا۔

سریۂ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بذی القصہ:

سریۂ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے بعد ۶ ہجری ربیع الآخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو چالیس آدمیوں کے ہمراہ ذی القصّہ بھیجا۔ یہ لوگ راتوں رات گئے اور صبح کو اچانک ان پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ تاب نہ لا سکے اور پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے۔ ایک شخص ملا جو مسلمان ہو گیا اس لیے اس کو چھوڑ دیا۔ لیکن ان کے تمام مویشی اور اسباب کو مدینہ لے آئے۔[۱]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کفار جب مسلمانوں کی جانوں کا نقصان کر دیں تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے انتقام لیں اور اس صورت میں رات کو اچانک ان پر حملہ کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ اس سریہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بنی ثعلبہ پر اچانک رات کو حملہ کر کے ان کو شکست دی اور ان کا تمام مال واسباب مدینہ لے آئے۔

سریۂ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بنی سلیم:

سریۂ ابو عبیدہ بن الجراح کے بعد اسی ربیع الآخر ۶ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کے ہمراہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنی سلیم کی طرف جموم بھیجا۔ جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو وہاں انہیں ایک عورت ملی جس کا نام حلیمہ تھا۔ اس نے بنی سلیم کے ایک مقام کا پتہ بتایا جہاں ان کے جانور رہتے تھے وہاں بہت سے اونٹ، بکریاں اور قیدی ملے۔ ان قیدیوں میں حلیمہ کا شوہر بھی تھا۔ یہ سب کو مدینہ لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلیمہ اور اس کے شوہر کو آزاد کر دیا۔[۲]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی کافر بھی آپ کے اوپر احسان کرے اور جب وہ قیدی بن کر یا کوئی اور مشکل لے کر آپ کے پاس آئے تو آپ کو بھی چاہیے کہ آپ اس پر احسان کرتے ہوئے اس کے معاملے میں آسانی پیدا کر دیں جیسا کہ اس سریہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلیمہ اور اس کے شوہر کو آزاد کر دیا۔

سریۂ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بعیص:

بعیص (بکسر عین مہملہ و سکون تحتانیہ) مدینہ سے چار میل کی مسافت پر ایک مقام ہے۔ اسی جمادی الاولیٰ (جس میں سریۂ زید بن حارثہ بطرق بنی ثعلبہ پیش آیا) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر آدمیوں کے ساتھ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۳۸

۲۔ ایضاً

کو عیص بھیجا۔ غرض یہ تھی کہ قریش کا ایک قافلہ جو شام کی طرف گیا تھا اس کو روکا جائے۔ چنانچہ اس قافلے کو ان لوگوں نے روکا آدمیوں کو گرفتار کیا اور اموال پر قبضہ کر لیا۔[1]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کفار کو معاشی طور پر کمزور کرنے کے لیے ان کی تجارتی راستوں اور تجارتی قافلوں پر حملہ کرنا مسلمانوں کے لیے جائز اور حلال ہے تاکہ ان کے پاس مسلمانوں کے خلاف طاقت جمع کرنے کے لئے کوئی اسباب نہ ہوں۔ جیسا کہ اس سریہ میں آپ ﷺ کے حکم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کفار قریش کے تجارتی قافلے پر حملہ کر کے ان کو گرفتار کیا اور ان کے اموال پر قبضہ کر لیا۔

سریۂ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بحسمی:

حسمی (حسم بحائے مہملہ و سین مہملہ) بنی جذام کا ایک شہر ہے اور "مدارج النبوہ"[2] میں ہے کہ یہ وادی القراء کے آگے ہے۔ علامہ واقدی[3] کہتے ہیں کہ اسی سال حضور ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو حسمی کی طرف بھیجا واقعہ یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو قیصر کے پاس دعوت اسلام کا خط لے کر بھیجا تھا۔ وہ جب واپس آرہے تھے اور ان کے ساتھ قیصر کے دیئے ہوئے تحائف بھی تھے۔ تو حسمی نے راستہ روکا اور سب چھین لیا۔ انہوں نے آکر رسول اللہ ﷺ کو خبر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو حسمی کی طرف بھیجا۔ اور دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے ساتھ واپس بھیجا انہوں نے جا کر انتقام لیا اور تحائف بھی واپس لائے اور ہزاروں جانور اور سیکڑوں قیدی بھی لائے۔[4]

یہ واقعہ یقیناً حدیبیہ کے بعد کا ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے حدیبیہ سے واپس آنے کے بعد محرم ۷ھ میں ایک روز چھ قاصد بادشاہوں کے پاس روانہ کیے، ان میں ایک دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ بھی تھے جو قیصر کے پاس حضور ﷺ کا خط لے کر گئے تھے۔[5]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی دشمن اسلام مسلمانوں کے قاصد کو جانی یا مالی نقصان پہنچائے تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے اس چیز کا بدلہ لیں۔ جیسا کہ اس سریہ میں حضور ﷺ نے زید بن حارثہ کو حسمی کی طرف روانہ کیا اور انہوں نے ان سے تحائف بھی واپس لیے اور ان کو شکست دے کر مال غنیمت بھی بہت سارا لے کر آئے۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۳۹

۲۔ دہلوی، مدارج النبوت، ص:۲۹۱

۳۔ علامہ واقدی (۱۰ ستمبر ۷۴۷ء ــ ۱۲ اپریل ۸۲۳ء) دوسری صدی ہجری کے مؤرخ ہیں۔

۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۴۲

۵۔ ایضاً، ص:۲۴۳

سریۂ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بفدک:

صاحب اصح السیر اپنی اس کتاب میں ابن قیم، واقدی کی روایت کو نقل کرتے ہیں [1] کہ اسی سال یعنی ۷ ہجری حضرت علی رضی اللہ عنہ دو سو آدمیوں کے ہمراہ فدک گئے۔ کیونکہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں قبیلہ بنی سعد بن بکر اسلام کے خلاف فوج جمع کر رہا ہے تاکہ اس سے خیبر کے یہود کی مدد کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے قافلہ کو لے کر اس طرح گئے کہ رات کو چلتے اور دن کو چھپ جاتے۔ راستے میں ان لوگوں کو ایک شخص ملا جس کو بنی سعد بن بکر نے خیبر بھیجا تھا اور امداد کا وعدہ کیا تھا۔ اس شرط پر کہ خیبر کی کھجور ان کو دی جائے۔ اس طرح تصدیق ہو جانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس قبیلہ پر یکایک حملہ کر دیا۔ جس کی وہ تاب نہ لا سکے اور بھاگ گئے۔ مسلمانوں کا کچھ نقصان نہ ہوا۔ پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں غنیمت میں ملیں جس کو یہ لوگ مدینہ لے آئے۔ [۲]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ کوئی قبیلہ مسلمانوں کے ساتھ بذات خود تو لڑائی نہیں کر رہا بلکہ جو کفار مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرنا چاہ رہے ہیں وہ ان کی مدد کر رہا ہے یا کرنا چاہ رہا ہے تو اس پر بھی حملہ کرنا مسلمانوں کے لیے جائز اور حلال ہے۔ کیونکہ وہ بھی مثل لڑائی کرنے والوں کے ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سریہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیبر کی مدد کرنے والوں پر حملہ کر کے ان کو شکست دی ان کے مال و اسباب کو مدینہ لے آئے۔

سریۂ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بدومۃ الجندل:

اسی سال ۷ ہجری شعبان کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل بھیجا۔ اور ان سے کہہ دیا کہ اگر قوم اسلام قبول کرلے تو آپ ان کے سردار کی لڑکی سے نکاح کر لیجئے گا وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تماضر بنت الاصبغ سے نکاح کر لیا۔ اصبغ اس قوم کا رائس اور سردار تھا۔ یہی تماضر بنت الاصبغ ابو سلمہ بن عبد الرحمن کی ماں ہیں۔ ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف اکابر تابعین میں سے ہیں اور مدینہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ [۳]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سپہ سالار کے لیے قبیلے کے سردار کی لڑکی سے نکاح کرنا اس لیے بھی جائز ہے کہ تاکہ وہ اسلام سے پھر نہ جائیں اور سردار کا اپنی بیٹی کو نکاح کے لیے پیش کر دینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اسلام لے کر آنے میں بھی مخلص ہیں اور امیر کی اطاعت میں بھی مخلص ہیں (کیونکہ یہ نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہوا تھا) اور تادم آخر اس پر قائم رہیں گے۔

۱۔ ابن قیم، محمد بن أبی بکر، زاد المعاد فی هدي خير العباد، مؤسسہ الرسالہ، (بیروت، الطبعہ السابعہ والعشرون، ۱۴۱۵ھ، ۱۹۹۴ء)، ص: ۲/ ۸۵۵

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۴۳/ یہ قصہ بالتفصیل "مدارج النبوت" میں موجود ہے۔

۳۔ ایضاً، ص: ۲۴۳

خیبر اور عمرۃ القضاء کے درمیان کے سرایا

حضور ﷺ جب خیبر سے مدینہ لوٹ کر آئے تو شوال تک مدینہ میں رہے۔اور اس دوران حضور ﷺ نے مختلف اطراف میں مختلف سرایا بھیجے۔ان سرایا کی ترتیب اور تاریخ میں بہت اختلاف ہے۔ مگر یہاں صرف ان سرایا کا ذکر کریں گے جو راجح قرائن کے اعتبار سے خیبر اور عمرۃ القضاء کے درمیانی عرصہ میں واقع ہوئے ہونگے۔[1]

سریۂ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

ان سرایا میں ایک سریۂ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہے کہ ان کو حضور ﷺ نے نجد میں بنی فزارہ کی جانب بھیجا۔ اور ان کے ہمراہ سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ بھی تھے۔[2]

سریۂ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ:

ان میں دوسرا سریۂ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہے۔انہیں حضور ﷺ نے تیس سواروں کے ہمراہ بنی ہوازن کی طرف بھیجا۔ مگر خبر ملتے ہی وہ سب بھاگ گئے۔ ایک دوسری مخالف جماعت کا پتہ چلا۔ لیکن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان سے لڑنے کا ہمیں حضور ﷺ نے حکم نہیں دیا۔[3]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امیر آپ کو جس قبیلہ کی طرف بھیجے آپ صرف اسی سے لڑائی کر سکتے ہیں، اگرچہ دوسری مخالف جماعت کا پتہ بھی چلے پھر بھی اس کے ساتھ لڑائی کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ لڑائی سے باز رہیں۔ جیسا کہ اس سریہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دوسری مخالف جماعت کا پتہ چلنے کے باوجود کہا کہ ان سے لڑنے کا چونکہ ہمیں حضور ﷺ نے حکم نہیں دیا اس لئے ہم ان سے لڑائی نہیں کریں گے۔

سریۂ عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ:

حضور ﷺ نے عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو تیس سواروں کے ہمراہ بشیر بن وارم یہودی کی طرف بھیجا۔ ان کے ساتھ عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضور ﷺ کو خبر ملی تھی کہ بشیر بن وارم نے بنی غطفان کو لڑنے کے لیے جمع کیا ہے۔ یہ لوگ اس کو اور اس کے تیس ساتھیوں کو کچھ باتیں بنا کر خیبر کے باہر لے آئے۔ تیس مسلمان تیس یہودیوں کے مقابلے میں تھے جب کچھ دور آئے تو ہر مسلمان نے اپنے مقابل کو قتل کر دیا۔ صرف ایک شخص ان میں سے بچ گیا۔ اس سریۂ میں عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو کچھ چوٹ آئی تھی جب یہ لوگ مدینہ واپس پہنچے تو حضور ﷺ نے اس پر آب دہن

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۹۲

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

ڈال دیا وہ بالکل صحت یاب ہو گئے۔[1]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کے دوران لڑائی دشمن کو دھوکہ دینا جائز ہے اور اس کو دھوکے سے مارنا جنگ کی چالوں میں سے ایک ہے۔

سریۂ بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کو بنی مرہ کی طرف فدک بھیجا۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر ان کے مال پر غارت ڈالا اور ان کے اونٹ اور بکریاں ہانک کر مدینہ لے آئے۔ انہوں نے پیچھا کیا اور راستہ میں لڑائی ہوئی۔ ان میں سے کچھ بھاگ گئے اور کچھ قید ہوئے مسلمان تمام غنیمت ساتھ لے کر مدینہ آ گئے۔ مگر اس سریہ میں بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے۔ اس لیے وہ فدک واپس گئے اور وہاں ایک یہودی کے ہاں رہے جب صحت اچھی ہو گئی تب مدینہ واپس آئے۔[2]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر آپ کے کفار کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں اور آپ کو اطمینان ہے کہ یہ آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ تو آپ بامر مجبوری ان کے پاس رہ سکتے ہیں جیسا کہ اس سریہ میں بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہونے کی وجہ سے واپس نہ جا سکے اور ایک یہودی کے پاس رہ گئے اور جب صحت یاب ہو گئے تو مدینہ واپس لوٹ گئے۔

سریۂ حضرت غالب رضی اللہ عنہ بہ جانب بنی الملوح:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غالب بن عبد اللہ الکلبی رضی اللہ عنہ کو بنی الملوح کی جانب کدید بھیجا اسی کو "قدید" بھی کہتے ہیں۔ ابن قیم ابن اسحاق سے نقل کرتے ہیں[3] کہ جندب بن مکیث الجہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں بھی اس سریۂ میں تھا۔ جب ہم لوگ قدید پہنچے تو حارث بن مالک بن البرضاء اللیثی ہمیں ملا تو ہم نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے کہا ہم تو یہاں مسلمان ہونے کے لیے آئے ہیں۔ حضرت غالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر تم مسلمان ہونے کے لئے آئے ہو تو ایک دن اور ایک رات یہاں ٹھہرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اور اس کو باندھ کر وہیں چھوڑ دیا اور چند حبشیوں کو وہاں اس کے پاس ٹھہرا دیا کہ میرے آنے تک اس کو دیکھتے رہو۔ اگر یہ کوئی شرارت کرے تو اسے قتل کر دینا۔ اس کے بعد ہم لوگ عصر کے بعد قدید پہنچے تو وہیں ٹھہر گئے۔ جب رات کافی ہو گئی تو غارت ڈالا جس کو قتل ہونا تھا قتل ہوا اور ہم ان کے مویشیوں کو لے کر نکلے۔ ان لوگوں نے اپنی قوم میں آواز دی۔ مگر ہم لوگ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے حارث کو اور دوسرے آدمیوں کو ساتھ لیا ہوا تھا ہم لوگ ان کے شور کی آواز بھی سن رہے تھے۔ وہ لوگ بھی تیزی سے آئے حتّٰی کہ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۹۲

۲۔ ایضاً، ص:۲۹۳-۲۹۴

۳۔ ابن قیم، زاد المعاد، ص:۲/۹۷۵/ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص:۱/۳۴۵

میرے اور ان کے درمیان صرف قدید کی وادی رہ گئی تھی۔ مگر نہیں معلوم کس طرح اس وادی میں اچانک سے سیلاب آگیا۔ حالانکہ اس سے پہلے سے کچھ بارش وغیرہ بھی وہاں نہ ہوئی تھی اب وہ ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم ان کو مگر آگے بڑھنے کی ہمت کسی کی نہ ہوئی۔ ہم تمام مال غنیمت لے کر مدینہ چلے آئے۔ (۱)

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی لشکر اللہ کے راستے میں لڑنے کے لیے نکلتا ہے تو تائید غیبی سے اس کی مدد کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس سریہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے سیلاب کی صورت میں مسلمانوں کی مدد کی یعنی کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان سیلاب کو حائل کر دیا اور مسلمان بغیر کسی جانی نقصان کے مال غنیمت کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے۔

سریہ بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ:

حُسیل بن نویرہ (۲) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ یمن، غطفان اور حیان کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ان سب کا ارادہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اطراف پر حملہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ کو تین سو آدمیوں کے ہمراہ روانہ کیا۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر پہلے غارت ڈالا۔ یہ خبر سن کر وہ جماعت منتشر ہو گئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دور تک ان کے پیچھے گئے مگر کوئی نہ ملا۔ صحابہ ان کے مویشیوں کو لے کر واپس چل دیے۔ راستے میں عیینہ کا جاسوس ملا اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس جماعت کے دو آدمی ملے یہ لوگ انہیں مدینہ لے آئے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ (۳)

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو کفار کی تیاری کا علم ہو جائے تو ان پر حملہ کرنا جائز ہے اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کفار کا جاسوس آپ کے علاقے کی مخبری کر کے واپس جارہا ہے اور آپ کو اس کا علم ہو جائے تو اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ تاکہ آپ کی تیاری اور طاقت کا علم کفار کو نہ ہو سکے۔ اور اگر کوئی عام آدمی مل جائے کفار میں سے رستے میں اور وہ لڑائی کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو پھر اس کے قتل کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کو قید کر لیا جائے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سریہ میں جاسوس کو قتل کر دیا اور باقی دو لوگوں کو قیدی بنا کر مدینہ لے آئے جو کہ بعد میں مسلمانوں کے حسن سلوک کی وجہ سے مسلمان ہو گئے۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۹۴-۲۹۳

۲۔ حسیل ابن نویرہ بعض ابن خارجہ بھی کہتے ہیں، حسیل وہی شخص ہیں جن کو خیبر کا راستہ بتانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اجرت پر مقرر کیا تھا۔ بعد میں یہ مسلمان ہو گئے۔ (داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۹۴)

۳۔ ایضاً، ص: ۲۹۴-۲۹۵

سریۂ ابو حدرد الا سلمی رضی اللہ عنہ:

قیس بن رفاعہ یا رفاعہ بن قیس بنی جشم کا معزز شخص تھا۔ اس کے پاس کچھ لوگ جمع ہوئے کہ اس کو رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر آمادہ کریں۔ جب حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ابو حدرد الا سلمی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ دو اور آدمیوں کو بھیجا کہ اس کی خبر لاؤ۔ خود ابو حدرد الا سلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم غروب آفتاب کے قریب وہاں پہنچے جہاں لوگ جمع تھے۔ ہم اس کے ایک طرف چھپ گئے اور اس کے دوسری طرف ساتھیوں کو چھپنے کے لئے کہا اور ان سے کہہ دیا کہ اگر ہم تکبیر کہیں تو تم بھی ساتھ اللہ اکبر کہہ کر باہر نکل آنا۔ اس روز قیس کا چرواہا کسی وجہ سے دیر تک نہ آیا تو قیس نے کہا کہ ضرور کوئی حادثہ ہوا ہے۔ اس نے تلوار اٹھائی اور دیکھنے کے لئے باہر نکلا باقی لوگ ساتھ آنے لگے تو اس نے انہیں منع کیا کہ کوئی بھی نہ آئے اور اکیلا نکل آیا۔ جب میری جگہ کے قریب آیا تو ہم نے ٹھیک اس کے سینے پر تیر مارا جس سے وہ فوراً گر گیا۔ میں نے نکل کر گردن کاٹ دی اور اللہ اکبر کہا یہ سن کر ہمارے ساتھیوں نے بھی اللہ اکبر کہا اور نکل آئے۔ جو لوگ وہاں جمع تھے انہوں نے سمجھا کہ فوج آگئی ہے، سب بھاگ گئے۔ ہمیں وہاں سے بہت سے مویشی اور غنیمت ملا جس کو ہم مدینہ ساتھ لے آئے۔ حضور ﷺ نے اس میں سے تیرہ اونٹ ہمیں دیے۔[1]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ضرورت دفاع کے لئے کفار کی جاسوسی کرنا ان کی ٹوہ لینا جائز ہے۔ اور جاسوس کے لئے جائز ہے کہ اگر موقع ملے تو ان کے سردار کو بھی قتل کر دے تاکہ کفار پر رعب پڑ جائے اور وہ آئندہ ایسے ارادوں سے باز رہیں۔ جیسا کہ اس سریہ میں ابو حدرد الا سلمی رضی اللہ عنہ نے کفار کے سردار کو قتل کر دیا اور باقی آپ کے رعب کی وجہ سے بھاگ گئے۔

سریۂ ابو قتادہ و محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہما:

حضور ﷺ نے ایک سریہ بھیجا۔ جس میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اور محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کو راستہ میں عامر بن الاضبط الاشجعی چند آدمیوں کے ہمراہ ملا۔ اس نے مسلمانوں کی طرح ان لوگوں کو سلام کیا۔ لیکن محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا اور اس کا اونٹ وغیرہ لے لیا۔ جب یہ لوگ واپس مدینہ لوٹے اور حضور ﷺ کو اس کی خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾[2]

ترجمہ: اے ایمان والو جب اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو اور اس شخص کو جو تم کو سلام کرے

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۹۶

۲۔ النساء:۴/۹۴

نہ کہو تو مسلمان نہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اکبر اس نے اٰمنت باللہ کہا پھر بھی آپ نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد عیینہ بن بدر آیا اور اس نے عامر کے خون کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ وہ بنی قیس کا سردار تھا۔ حضور ﷺ نے عامر کی قوم کو کہا کہ ہم دیت میں پچاس اونٹ اس وقت دیتے ہیں اور پچاس مدینہ پہنچنے کے بعد دیں گے ان لوگوں نے دیت قبول کرلی۔ لوگ محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کے پاس لائے کہ اس کے لیے مغفرت کی دعاء کیجیے۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے مغفرت کی دعا کی۔[1]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی طرح آپ کو سلام کرے اور آپ کو علم نہ ہو کہ یہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہے یا واقعی دل سے مسلمان ہوا ہے تو بھی آپ اس کو قتل نہیں کر سکتے اس پر قرآن کی آیت بھی دال ہے اور آپ ﷺ کا عمل بھی یعنی کہ مقتول کے دیت دینا اور محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہ کے لئے مغفرت کی دعا کرنا واضح دلیل ہے۔

سریۂ عبد اللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ:

انصار کے ایک شخص کو حضور ﷺ نے ایک سریۂ کا امیر بنا کر بھیجا۔ اور حکم دیا کہ ان کی سنو اور اتباع کرو۔ وہ شخص کسی بات پر ان لوگوں سے ناخوش ہو گیا اور اس نے ان لوگوں سے لکڑیاں جمع کروائیں پھر اس میں آگ لگوائی اس کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے حکم نہیں دیا کہ تم لوگ میری بات سنو اور اتباع کرو۔ سب نے کہا کہ ہاں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ تم سب اس آگ میں داخل ہو جاؤ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر سب نے کہا کہ ہم اسی آگ کے عذاب سے بچنے کے لیے تو رسول اللہ ﷺ کی طرف بھاگے ہیں۔ اس پر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور آگ بجھادی گئی۔[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

> "أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ"[3] کی آیت عبد اللہ بن حذافہ السہمی کے قصہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ جب حضور ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا کہ اگر یہ لوگ آگ میں داخل ہو جاتے تو کبھی آگ سے نہ نکل پاتے یعنی کہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو جاتے۔[4]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۹۵-۲۹۶

۲۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (دار طوق النجاۃ) كتاب المغازي، باب سرية عبد الله بن حذافة السهمي...، حدیث: ۴۰۸۵،

۳۔ سورۃ النساء: ۴/۵۹

۴۔ بخاری، كتاب التفسير، باب تفسير سورة النساء، حدیث: ۴۳۰۸، ص: ۴/۱۶۷۴

اس سریہ میں پیش آنے والے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت محض معروف (نیکی) میں ہے منکر (برائی) میں نہیں ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب تعذیب نفس امیر کی اطاعت میں حرام ہے تو تعذیبِ مسلم یاترک اوامر یا فعلِ نواہی امیر کے حکم، والدین یا کسی بھی بڑے کے حکم سے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اور اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی نافرمانی کسی مخلوق کی اطاعت کی وجہ سے قطعاً جائز نہیں۔

بعض سرایا

رجب ۸ ہجری میں آپ ﷺ نے ایک سریہ بھیجا اور پھر آپ ﷺ فتح مکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد مدینہ واپس آئے اور محرم ۹ ہجری سے آپ ﷺ نے سرایا کا سلسلہ جاری فرمایا۔

سریۂ قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ الیٰ خثعم:

صاحب اصح السیر ابن سعد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بیس آدمیوں کے ہمراہ اونٹ پر خثعم کے ایک قبیلہ کی طرف بھیجا۔ ان لوگوں نے وہاں ایک شخص کو پکڑا اس سے کچھ باتیں دریافت کیں۔ وہ پہلے تو گونگا بن گیا مگر تھوڑی دیر کے بعد لوگوں کو پکار کر خبر دار کرنے لگا۔ انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور وہاں ٹھہرے رہے جب لوگ سو گئے تو انہوں نے حملہ کر دیا بڑی لڑائی ہوئی خود قطبہ بن عامر شہید ہو گئے، بقیہ آدمی ان کی عورتیں، اونٹ اور بکریاں لے کر مدینہ آئے۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ یہ سریہ ۰۹ ہجری میں ہوا۔[1] اور اس سریہ میں بھی یہ واقعہ مروی ہے کہ جب مسلمان جانور اور قیدیوں کو لے کر چلے تو خثعم کے لوگوں نے ان کا تعاقب کیا۔ مگر اس وقت بھی بیچ میں سیلاب حائل ہو گیا جس کو وہ لوگ پار کرنے سے قاصر رہے اور دیکھتے رہے۔ یہ لوگ سب کچھ لے کر مدینہ آ گئے۔[2]

اس سریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرے یا یہ تمہارے آنے کی خبر اپنے قبیلے کو دے یا قبیلہ والوں کو مدد کے لیے پکارے تو ایسے شخص کو بھی قتل کر دینا چاہیے کیونکہ لڑائی کے لیے پکارنے والا بھی مثل لڑائی کرنے والوں کے ہی ہوتا ہے دوسری اس سریہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے راستے میں لڑنے والوں کے ساتھ اللہ کی غیبی مدد ہوتی ہے جیسا کہ اس سریہ میں بھی جب کفار نے مسلمانوں کا تعاقب کیا تو درمیان میں سیلاب حائل ہو گیا جس کو وہ لوگ عبور نہ کر سکے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب مال غنیمت لے کر مدینہ پہنچ گئے۔

سریۂ ضحاک ابن سفیان کلابی رضی اللہ عنہ:

اس کے بعد ۹ ہجری ربیع الاوّل میں حضور ﷺ نے ایک فوج بنی کلاب کی طرف روانہ فرمائی اور اس پر ضحاک

۱۔ ابن قیم، زاد المعاد، ص: ۲/ ۹۷۲

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۸۰

بن سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا۔ اصید بن سلمہ رضی اللہ عنہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ زج میں جنگ ہوئی اور کفار کو ہزیمت اٹھانی پڑی ۔ اسی سریہ میں ایک کنویں پر اصید بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو ان کے باپ سلمہ ملے ۔ سلمہ اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ اصید نے اپنے باپ سلمہ کو اسلام کی دعوت دی اور امان دی۔ مگر اس کے باپ نے اصید اور اس کے دین کو گالی دی۔ جس پر اصید نے سلمہ کے گھوڑے کو تلوار ماری وہ گر گیا، اور خود سلمہ نیزے کے بل پانی میں گرا، یہ وہاں رکے رہے یہاں تک کہ ایک شخص نے آکر اس کو قتل کر دیا خود اصید رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا۔ (۱)

اس سریہ میں اصید بن سلمہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ والد کافر ہو اور آپ کے دین کو برا بھلا بھی کہے پھر بھی جتنا ہو سکے اپنی تلوار سے قتل کرنے سے گریز کیا جائے جیسا کہ اصید بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے گھوڑے پر تو حملہ کیا لیکن خود ان پر حملہ کرنے سے رکے رہے یہاں تک کہ ان کے ساتھی نے ان کو قتل کیا خود اصید بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد پر تلوار نہیں اٹھائی۔

سریۂ علقمہ بن مُجزز رضی اللہ عنہ الی الحبشہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ جدہ میں کچھ حبشی آئے ہیں۔ ربیع الآخر ۹ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علقمہ بن مجزز المدلجی رضی اللہ عنہ کو تین سو آدمیوں کو ہمراہ وہاں بھیجا۔ یہ لوگ وہاں پہنچے تو وہ سب بھاگ گئے۔ یہ لوگ بعض جزیرہ تک گئے مگر وہ سمندر میں لاپتہ ہو گئے یہ لوگ واپس لوٹ آئے۔ مگر فوج کے کچھ آدمیوں نے اپنے اہل کی طرف جانے میں جلدی کی اور ان میں عبد اللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ راستہ میں بعض مقام پر علقمہ بن مجزز رضی اللہ عنہ نے آگ جلوائی اور جلدی کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ اس آگ میں داخل ہو جاؤ۔ جب کچھ لوگ آگ میں جانے کے لیے تیار ہو گئے تو علقمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ٹھہرو! ہم نے مذاق سے کہا تھا: جب یہ لوگ مدینہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی معصیت کا حکم دے تو نہ مانو۔ (۲)

سریۂ عبد اللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ میں پیش آنے والے واقعہ سے ملتا جلتا یہ بھی واقعہ ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو۔ لیکن جب اس واقعہ کی اطلاع بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی بھی تمہیں معصیت کا حکم دے تو اس سے انکار کر دو۔ اس سریہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وجہ جو کوئی بھی ہو لیکن معصیت والے کاموں کا حکم دینے والوں کی بات بلکل نہیں مانگنی چاہیے اگرچہ والدین یا اساتذہ بھی کیوں نہ ہوں۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۸۰-۳۸۱

۲۔ (مگر فوج کے کچھ آدمیوں نے اپنے اہل کی طرف جانے میں جلدی کی اور ان میں عبد اللہ بن حذافہ السہمی بھی تھے۔ راستہ میں بعض مقام پر علقمہ بن مجزز نے آگ جلوائی اور ان جلدی کرنے والوں کو کہا کہ تم لوگ آگ میں داخل ہو جاؤ جب ان میں سے کچھ لوگ آگ میں جانے کے لیے مستعد معلوم ہوئے تو علقمہ نے کہا کہ: ٹھہرو، ہم نے تو مذاق سے کہا تھا جب یہ لوگ مدینہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا کوئی معصیت کا حکم دے تو نہ مانو۔ (داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۸۱)

سریۂ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ الیٰ طی:

اسی سال ۹ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طی کی طرف بھیجا کہ وہ قبیلہ طی کے بت خانہ کو گرا دیں۔ ان کے ساتھ ایک سو پچاس گھڑ سوار تھے۔ یہ لوگ جب قُلس پہنچے تو فجر کے وقت حملہ کیا اور بت خانہ کو گرادیا۔ پھر عورتوں کو ان کے اونٹ اور بکریوں سمیت قید کر لیا۔ ان قیدی عورتوں میں مشہور حاتم طائی کی لڑکی اور عدی بن حاتم کی بہن بھی تھی۔ خود عدی بن حاتم بھاگ کر شام چلا گیا ان کے اسلحہ خانہ سے تین تلواریں اور تین زرعیں ملیں۔ جن کو یہ لوگ مدینہ لے آئے۔ وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اور میرا محافظ ہمیں چھوڑ کر غائب ہو گیا میں ضعیف ہوں اور کسی خدمت کے لائق بھی نہیں ہوں۔ مجھ پر احسان کیجئے خدا آپ پر احسان کرے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارا محافظ کون تھا؟ کہا کہ عدی بن حاتم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ دیا اور جانے کے لیے اونٹ بھی دیا۔ (۱)

اس سریہ میں پیش آنے والے واقعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی قیدی ضعیف ہو اور کسی خدمت کے قابل بھی نہ ہو، اور احسان کی درخواست کرے تو تو اس پر احسان کر دیا جائے۔ اور اگر اس کے پاس اسباب نہ ہوں تو اسباب بھی مہیا کر دیے جائیں مثلاً سواری اور راشن وغیرہ۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سریہ میں عدی بن حاتم کی بہن پر احسان کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیا اور واپس جانے کے لئے اونٹ بھی دیا۔

خلاصہ بحث

اصح قول کے مطابق سرایا کی تعداد ۴۸ ہے۔ سریۂ کی خصوصیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خفیہ فوجی مہم ہوتی ہے اور اس کو خفیہ رکھنے کے لئے افراد کی تعداد کم رکھی جاتی ہے اس کا سفر رات کو ہوتا ہے اور قائد ساتھ نہیں ہوتا۔ چناچہ روایات میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سرایا میں خود نہیں جاتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہونے والے تمام سرایا انہی خصوصیات کے حامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہادری، قربانی اور عقیدے کی مضبوطی، صدق جہاد اور قوت ایمانی کے ایسے نمونے پائے جاتے ہیں جنہیں سمجھنا اور یاد رکھنا چاہیے۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر: ۳۸۲

فصل سوم

"اصح السیر" کا اسلوب و منہج اور خصوصیات

ا۔ مؤلف کا تعارف

مولانا عبد الرؤف داناپوری کے احوال و آثار

مولانا عبد الرؤف داناپوری ایک مایہ ناز عالم دین، ماہر طبیب اور بہت زبردست سیاست دان بھی تھے۔ آپ کے احوال و آثار اور علمی، طبی اور سیاسی خدمات کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے۔

نام و جائے پیدائش:

آپ کا نام عبد الرؤف اور کنیت ابوالبرکات ہے۔ آپ کی جائے پیدائش داناپور ہے اور اسی نسبت سے آپ داناپوری کہلائے جاتے ہیں۔ آپ سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے۔ اسی وجہ قادری کہلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ حکمت وطباعت میں بھی مہارت رکھتے تھے اور تمام عمر اسی پیشے سے منسلک رہنے کی وجہ سے حکیم بھی کہلائے جاتے۔

حکیم مولانا ابوالبرکات عبد الرؤف قادری داناپوری قریباً ۱۸۴۵ء کے قریب شہر داناپور محلہ شاہ ٹولی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی گھر موضع دانہ پور گھوسیرہ ضلع پٹنہ میں واقع تھا۔[۱]

والد گرامی:

آپ کا خاندان علم و فضل اور حسب و نسب کی بنیاد پر ہمیشہ ممتاز رہا۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی عبد القادر صاحب بڑے صاحبِ علم تھے۔ موضع داناپور گھوسیرہ کے اطراف میں ان کے بے شمار شاگرد تھے۔[۲]

ابتدائی تعلیم و تربیت:

آپ کو علم سے جو گہرا شغف تھا وہ بڑی حد تک خاندانی اثرات کا نتیجہ تھا۔ آپ کے والدِ محترم چونکہ ایک عظیم و بلند پایہ عالمِ دین تھے اس لیے انہوں نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ آپ نے اپنے والد گرامی کے پاس اس وقت کے مروجہ دینی علوم سیکھنے سے اپنی تعلیم کی ابتداء کی۔[۳]

۱۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، (پٹنہ، انڈیا)، ص:۱/ ۸۲

۲۔ ایضاً، ص:۱/ ۷۲

۳۔ محمد حسام، مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، تحقیقی مقالہ، (معارفِ اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ:۱۵، ۲۰۱۶ء) ص:۱۵-۱۶

اعلیٰ تعلیم کے لیے سفر:

ابتدائی تعلیم کے حصول سے فراغت کے بعد آپ نے مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ اور حیدر آباد کے سفر اختیار کیے۔ جہاں آپ نے اس زمانہ کے جید علماءِ دین سے دین کا علم حاصل کیا اور وہاں مشہور اطباء سے طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔[1]

کلکتہ آمد:

حکیم صاحب بیسویں صدی کے اوائل میں ہی کلکتہ چلے آئے تھے اور پھر عمر کے آخری حصے تک یہیں رہ کر طباعت کرتے رہے تھے۔ "تاریخ اطباء بہار" میں یہ بات تفصیلاً مذکور ہے۔

حکیم صاحب کے کلکتہ میں قیام کے متعلق سید سلمان ندوی اپنی تصنیف "یادرفتگاں" میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

"میری ان کی پہلی جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کلکتہ کی ادارات کے لیے کلکتہ پہنچا مرحوم سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور خیال آتا ہے کہ ان کی قیام گاہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا جو چونا گلی میں تھی اور جہاں مرحوم نے وفات پائی۔"[2]

عادات و معمولات:

مولانا صاحب صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد ناشتہ کرنے کے عادی تھے۔ اسی دوران انگریزی اور اردو کے اخبارات آجاتے آپ نو بجے تک ان اخبارات کا مطالعہ فرماتے اور پھر اس کے بعد مریضوں کو دیکھتے تھے۔ مریضوں کو دیکھنے کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ بھی چلتا رہتا۔ صبح سے شروع ہونے والا کتابوں کا یہ مطالعہ تقریباً رات بارہ بجے تک جاری رہتا اور اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔ آپؒ نے زندگی بھر بلاناغہ مغرب کی نماز جامع مسجد زکریا اسٹریٹ کلکتہ میں ادا کی۔ سردی ہو یا گرمی بروزِ جمعہ گیارہ بجے پابندی کے ساتھ مسجد میں پہنچ جاتے اور سب سے اگلی صف میں امام کے پہلو میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہاں آخر میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپ ثقلِ سماعت میں بھی مبتلاء تھے۔ قدرت کا یہ عجیب نظام ہے کہ جب کسی انسان میں کسی ایک چیز کی کمی ہوتی ہے تو اس کی تلافی کے لیے بعض دوسری چیزوں میں اضافی قوّت دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ تاحیات آپ کی نا تو دماغی صلاحیتوں میں کبھی ضعف پیدا ہوا اور نہ ہی بصیرت میں کچھ فرق آیا۔[3]

۱۔ مولانا عبدالرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، ص:۱۵

۲۔ ندوی، سید سلمان، یادرفتگاں، (مجلس نشریات اسلام، کراچی) ص:۲۶۲-۲۶۳

۳۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/۴۷

طب میں عملی خدمات:

شعبہ طب کے میدان میں آپ کی خدمات کا دائرہ کار بہت وسیع ہے جس کو حکیم مولانا اسرارالحق نے اپنی تصنیف "تاریخ اطباء بہار" میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ؛کلکتہ میں جب انجمن اطباء قائم ہوئی تو آپ کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا گیا اور آپ کی یہ صدارت سالہاسال قائم رہی۔ آپ کی کوششوں سے حکومت بنگال نے بھی اس انجمن کے بورڈ آف فیکلٹی کو تسلیم کر لیا تھا۔ مولانا کو ۱۹۱۱ء میں انجمن اطباء کلکتہ کا سیکرٹری منتخب کر دیا گیا۔ آپ نے انجمن کا دستور منتخب کیا اور وہ دستور ۱۴ مارچ ۱۹۱۶ء کو منظور ہوا۔ انہی دنوں میں نواب شمس الدین مرحوم صوبہ بنگال کے وزیرِ تعلیم مقرر ہوئے تو آپ نے ان کے توسط سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نصاب میں طبی کتابوں کو داخل کرانے کی تحریک پورے انہاک سے شروع کر دی۔ آپ کی یہ کوشش نتیجہ بر آور ہوئی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کا نصاب مع طبی کتابوں کے شائع ہو گیا۔

آپ نے انجمن میں طریقہ تعلیمِ طب کے لیے بطورِ اصلاح بھی ایک نصاب مرتب فرمایا تھا جو منظور ہو گیا۔ اور آپ ہی کی کوششوں سے ۱۷ جنوری ۱۹۲۶ء میں طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جب حکومت نے طبیہ کالج قائم کرنے کی تجویز منظور کر لی تو حکومت کی طرف سے آپ کو پرنسپل کا عہدہ پیش کیا گیا جس کے قبول کرنے سے آپ نے اس بنیاد پر انکار کر دیا کہ آپ ملازمت کے قائل نہ تھے۔

اس کے علاوہ آپ نے ۱۹۳۹ء میں بنگال میں طبی فیکلٹی کے قیام کے لیے کوشش کی آپ کی اس کوشش میں شفاء الملک حکیم ثناء احمد خان صاحب مرحوم بھی آپؒ کے ساتھ تھے۔[۱]

طب میں تصنیفی خدمات:

طب کے میدان میں ان تمام عملی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ نے تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں۔ آپ کے طب کے موضوع پر لکھے گئے رسالے اور کتب بھی شعبۂ طب کے لیے اہم خدمات تھیں۔ جن سے شعبۂ طب بہت زیادہ مستفید ہوا۔ جس کا منہ بولتا ثبوت طبیہ کالج کا قیام ہے۔

آپ کی چند ایک تصانیف درج ذیل ہیں۔

- مقالہ بعنوان حفظانِ صحت۔
- مقالہ بعنوان ملیریا۔
- رسالہ بعنوان تریاقِ سموم۔[۲]

۱۔ حکیم محمد اسرارالحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/۷۳-۷۷

۲۔ ایضاً

سیاسی خدمات و سر گرمیاں:

مولانا دانا پوری ایک ماہر طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک درد مند سیاستدان بھی تھے۔ آپ ہندوستان میں انگریزوں کی سامراجیت کے سخت خلاف تھے۔ اس لیے آپ ۱۹۱۶ء سے مسلسل انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں دل و جان سے شریک رہے۔ چناچہ ۱۹۲۱ء میں سوبھاس چندر بوس، آنجہانی سی-آر-داس، مولانا آزاداور آپ کو بعض دوسرے رہنماؤں کے ساتھ بیک وقت گرفتار کیا گیا اور چھ ماہ تک قید میں رکھا گیا۔

آپ کانگریس کے اہم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ کلکتہ خلافت کمیٹی کے برسوں صدر بھی رہے۔ بہار میں جب کانگریس، خلافت اور جمعیت علمائے ہند کا اجلاس ایک ساتھ ایک ہی وقت میں الگ الگ جگہ منعقد ہوا آپ کو جمعیت علمائے ہند کی مجلس استقبالیہ کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ صدرِ مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے جو آپ نے خطبہ دیا اس کے الفاظ بھی ایک تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔[۱]

سید سلمان ندوی آپ کی سیاسی سرگرمیوں کا مختصر ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مرحوم سیاسیات میں جمعیت العلماء کے ساتھ تھے اور ان کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کر چکے تھے لیکن آخر میں اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ سے منسلک ہو گئے تھے اور اسی سے وہ بنگال کی اسلامی سیاست پر بہت اثر انداز تھے۔"[۲]

علمی و فکری خدمات:

مولانا عبد الرؤف دانا پوری کی تمام عمر علم کے حصول اور اس کی اشاعت میں گزری۔ آپ کو علم سے گہرا شغف تھا۔ آپ کو بچپن ہی سے مطالعہ کی عادت تھی جو عمر کے آخری حصّے تک رہی۔ آپ ایک ہمہ جہت جامع شخصیت تھے۔ ایک ہی وقت میں آپ ایک ماہر طبیب، ایک جید عالم دین اور ایک کہنہ مشق سیاستدان بھی تھے۔ آپ نے دینی، علمی و تحقیقی اور ملی شعبوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ مولانا کی تحریریں خواہ وہ طبی ہوں، دینی یا سیاسی ہوں وہ آپ کی گہری سمجھ بوجھ اور علم کا مظہر ہیں۔[۳]

دینی خدمات:

مولانا عبد الرؤف دانا پوری نے قوم و ملّت کی ہر لحاظ سے خدمت کی۔ آپ اپنے زمانہ کے مایہ ناز عالم دین تھے۔ آپ قرآن، علومِ قرآن اور علمِ تفسیر پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی دینی تصانیف آپ کی علمی حیثیت و مقام کا منہ

۱۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۴۷

۲۔ ندوی، یادِ رفتگاں، ص:۲۶۴

۳۔ مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، ص:۱۶

بولتا ثبوت ہیں۔

سید سلمان "یاد رفتگاں" میں آپ کی علمی بصیرت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"مجھے یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے تعلیم و تربیت کن اساتذہ سے حاصل کی مگر گفتگو اور تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو علومِ دینیہ میں پوری دسترس حاصل تھی۔"(۱)

مولانا دینی لحاظ سے بھی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بیک وقت ایک مفسّر، محدث اور سیرت نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ فقیہہ بھی تھے۔ آپ کی سیرت پر لکھی گئی کتاب "اصح السیر" بھی آپ کی علمی فقاہت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ آپ فکری لحاظ سے فقہ حنفی کے معتقد و پیروکار تھے۔ مگر آپ کو دیگر آئمہ فقہاء کی آراء اور ان کی فقہ پر بھی پوری طرح دسترس تھی۔(۲)

بطور فقیہہ:

فقہ میں مہارت کی وجہ اس میدان میں بھی آپ ایک الگ شان کے متحمل تھے۔ آپ کے متعلق اس حوالے سے حکیم اسرار الحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

"ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آپ کے پاس فتاویٰ آتے تھے۔ آپ نہایت تحقیق و حوالہ کے ساتھ جواب دیا کرتے تھے۔ اگر اختلافی مسائل ہوتے آپ وضاحت سے لکھتے اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہ قول ہے۔"(۳)

بطور مجتہد:

مولانا عبد الرؤف داناپوری کے بارے میں محمد حسام الدین اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں کہ:

"مولانا صرف مقلد نہیں تھے بلکہ آپ ذاتی اجتہاد کے قائل بھی تھے۔ اس چیز کا سب سے بڑا ثبوت آپ نے اپنی کتاب "اصح السیر" میں مختلف مسائل میں جہاں آئمہ اربعہ کے فیصلے درج کیے ہیں وہیں بعض مسائل میں ان سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ذاتی اجتہادی رائے بھی قائم کی ہے۔"(۴)

اس حوالے سے بھی حکیم اسرار الحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اگر صحیح حدیث اس مسئلے میں موجود ہوتی تو صاف صاف لکھتے کہ صحیح حدیث یہ ہے اور ائمہ اس مسئلے

۱۔ ندوی، یاد رفتگاں، ص:۲۶۲

۲۔ مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، تحقیقی مقالہ، ص:۱۷

۳۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/ ۴۷

۴۔ مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، تحقیقی مقالہ، ص:۱۷

میں اپنی رائے کے خود ذمہ دار ہیں۔"[۱]

اس حوالے سے سید سلمان ندوی کا یہ قول بھی قابلِ ذکر ہے۔

"وہ زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات وافکار سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان علماء میں سے تھے جو قدیم علوم اور اعتقاداتِ فقہ کو جدید خیالات وافکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے تھے۔"[۲]

یعنی کہ یہ ایک مولانا کی نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات وافکار سے پوری طرح آگاہ ہونے کے ساتھ ان علماء میں سے تھے جو قدیم علوم اور اعتقاداتِ فقہ کو جدید خیالات وافکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

علمی و دینی تصانیف:

مولانا عبد الرؤف داناپوری نے علمی و دینی حوالے ان گنت کتب لکھیں مگر آپ کی جو کتب فی زمانہ دستیاب ہو سکیں وہ درج ذیل ہیں۔

- اسلام اور موجودہ مدنی مسائل
- علمِ حقائق
- سیرتِ ازواجِ نبی ﷺ
- اصح السیر

اسلام اور موجودہ مدنی مسائل:

مولانا عبد الرؤف داناپوری کا یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں مولانا نے اسلامی تعلیمات وعبادات پر متکلمانہ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مقالہ میں انسانی عقل، عقلی علوم کی محدودیت، علمِ حقیقت، اسلامی نظامِ حکومت وسلطنت سے متعلق انسانی حقوق وفرائض، اقتصادیات، غربت، غلامی اور سرمایہ داری کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور موجودہ نظامِ حکومت کا موازنہ اور شرعی علم پر متکلمانہ اور عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا۔[۳]

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد نے اس مقالہ کو پڑھ کر مولانا کے نام ایک خط میں لکھا کہ آپ کا یہ مقالہ عوام سے

۱۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/ ۴۷

۲۔ ندوی، یادرفتگاں، ص:۳۶۲

۳۔ مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی وملی خدمات، تحقیقی مقالہ، ص:۱۹

زیادہ علماء کے لیے مشعلِ راہ ہو گا۔[1]

علمِ حقائق:

یہ مولانا عبد الرؤف داناپوری کا ایک اور تحقیقی مقالہ ہے جس میں مولانا نے فی زمانہ دنیا میں موجود مختلف مذاہب اور مکاتبِ فکر کے نقطۂ نظر کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپنے اس مقالہ میں فلاسفہ کے مختلف گروہوں اوران کے فلسفوں کو رد کیا اور فلسفہ ویدانت اور مسئلہ وحدت الوجود پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ مقالہ جنوری ۱۹۴۳ء میں ماہانہ برہان دہلی میں شائع ہوا۔[2]

حکیم محمد اسرار الحق کے مطابق مولانا کے تقریباً پچاس سے زائد کتابچے مطبوعہ ہیں۔ اور غیر مطبوعہ تصنیفات کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے۔[3]

سیرتِ ازواجِ نبی ﷺ:

مولانا عبد الرؤف داناپوری امہات المؤمنین کی مختصر سوانح حیات پر کتاب لکھی۔ جس میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی سیرت کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ ایک ایسی علمی تحقیقی تصنیف ہے جس کو پہلی مرتبہ کمال پریس نمبر پی / ۱۱۱۲ اسمٰعیل کلکتہ سے شائع ہوئی۔[4]

اولاد ووفات:

وفات کے وقت آپ کے تین لڑکے تھے۔ عبد المعدود، عبد الودود اور محمد مسعود اور ایک لڑکی فرخندہ بانو بھی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا نے ۲۰ اور ۲۱ فروری کی درمیانی شب کو کلکتہ میں وفات پائی اور وہیں مانک تلہ پشاوری گورستان میں مدفون ہوئے۔[5]

مولانا عبد الرؤف داناپوری نے تقریباً ۱۰۰ سال کے قریب عمر پائی۔ جبکہ علامہ سید سلمان ندوی مولانا کی عمر ۴۷ سال بیان کرتے ہیں۔[6]

۱۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/ ۷۳

۲۔ مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، تحقیقی مقالہ، ص:۱۹

۳۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/ ۷۳

۴۔ مولانا عبد الرؤف کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات، تحقیقی مقالہ، ص:۱۹

۵۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/ ۷۵

۶۔ ایضاً، ص:۱/ ۷۵

خلاصہ بحث

مولانا عبد الروف داناپوری ۱۸۵۶ء میں داناپور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تعلیم و تربیت اپنے وقت کے ماہر اساتذہ سے حاصل کی۔ آپ بیک وقت ایک ماہر طبیب، عالم دین اور زیرک سیاستدان تھے۔ آپ اپنی عمر کے اواخر تک ان تینوں شعبوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے بوجہ علالت ۱۹۴۸ء وفات پائی۔

۲۔ اصح السیر کا تعارف

وجہ تسمیہ:

مولانا عبد الروف داناپوری کی یہ کتاب "اصح السیر" کا نام اس کتاب کے مستند اور معتبر مصادر کی وجہ سے ہے جس کا ذکر کتاب کے شروع میں ہی اس کا مختصر تعارف کرانے کے بعد ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یہ سب چیزیں اصح ترین روایات سے ماخوذ ہیں"[۱]

یہی وجہ ہے کہ سیرت کی اس کتاب کا نام "**اصح السیر**" رکھا گیا ہے۔

اشاعت و طباعت:

البشریٰ ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ نے اس کتاب کو ۱۴۳۶ھ / ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔ یقیناً یہ اس کی اشاعت اوّل تو نہیں ہو سکتی، کیونکہ جب پہلی طبع ہوئی تو اس کی دو جلدی تھیں۔[۲]

مقام و مرتبہ کتاب:

اصح السیر کا شمار اردو کتب سیرت کی چند نمایاں کتب میں ہوتا ہے۔ اصح السیر اپنے مباحث، اسناد، مشمولات اور مخصوص اسلوب کی وجہ سے باقی کتب کی نسبت امتیازی مقام کی حامل کتاب ہے۔ اس کتاب کے مقام و مرتبہ کے بارے میں حکیم اسرار الحق لکھتے ہیں کہ:

"مولانا عبد الماجد دریابادی اور دیگر علماء نیز سترہ رسالوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اب تک اردو میں سیرت پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔"[۳]

مزید لکھتے ہیں کہ:

"اصح السیر" مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی ﷺ سے زیادہ جامع اور بہتر قرار دی گئی۔"[۴]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴

۲۔ حکیم محمد اسرار الحق، تاریخ اطباء بہار، ص:۱/ ۴۷

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

سید سلیمان ندوی اس کتاب کا یوں تذکرہ کرتے ہیں کہ:

"مولانا کی تصنیفات میں سے سب سے اہم کتاب اس "اصح السیر" ہے۔"[1]

کتاب کی اہم مباحث:

اس کتاب میں مقدمہ سیرت مع تاریخ عرب قبل بعثت مختصر مگر نہایت جامع ہے۔ پھر سیرت رسول از ولادت تا وفات، انساب کا حال، کتاب المغازی مکمل، کتاب الاموال مکمل، کتاب الوفود مکمل، رسول اللہ ﷺ کے قاصد، مکاتیب حجۃ الوداع کا مفصل حال، ازواج النبی ﷺ کے حالات اور بے شمار معلومات کا ذخیرہ ہے۔ سب سے اہم یہ ہے کہ معرکۃ الآراء مسائل پر عالمانہ بحث ہے۔ اور یہ سب چیزیں بہترین روایات سے ماخوذ ہیں اسی وجہ سے اس کا نام "اصح السیر" ہے۔

اسلوبِ خاص:

اس کتاب یعنی اصح السیر کا علمی و فقہی اسلوب اس کی شہرت کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہم نے اس کا اسلوب درج ذیل تین نکات کے ذریعے بیان کیا ہے۔

۱. انداز بیان
۲. مصادر و مراجع
۳. عمومی اسلوب

۱. انداز بیان: کتاب "اصح السیر" کا انداز بیان سادہ اور آسان فہم ہے۔ زبان سادہ ہے مگر کہیں کہیں مشکل الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یا تو ان کی تعریف کر دی جاتی ہے یا حواشی میں ان کا مطلب سمجھا دیا جاتا ہے تاکہ قاری کو کوئی مشکل نہ ہو۔ اور قارئین کی آسانی کے لئے ابواب مرتب کیے گئے ہیں۔ مثلاً کتاب الفود۔

۲. مصادر و مراجع: مولانا عبد الرؤف دانا پوریؒ نے اپنی کتاب اصح السیر میں قرآن، حدیث، تفسیر، کتب تاریخ، کتب احادیث، کتب فقہ، ائمہ حدیث اور ائمہ فقہاء کی آراء سے استفادہ کیا ہے۔

۳. عمومی اسلوب: اس کتاب اصح السیر میں اس کے مصادر سے استفادہ اور استدلال کا عمومی اسلوب درج ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

- مولانا عبد الرؤف دانا پوری نے اپنی کتاب کے آغاز میں انتہائی فصیح و بلیغ اور جامع مقدمہ لکھا ہے جس میں انسان کی حقیقت، مقصد حیات، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الہامی کتب کا مختصر بیان، قرآن کریم نزول اور اہمیت، سنن رسول ﷺ، صحائف صحابہ، اصحاب سنن، اوّلین کاتبین حدیث، حدیث اور سیرت میں فرق، سیرت کا تحریری مواد، تدوین و ترتیب، درایت و عقل پر مباحث، عقلوں کی گمراہی، جہاد فی سبیل اللہ پر نصاریٰ

۱۔ ندوی، یادِ رفتگاں، ص: ۳۶۴

کا اعتراض اور اس کا جواب، عقل سلیم، قدیم عرب اور ان کی تاریخ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

- جب قرآنی آیات لاتے ہیں تو بغیر اعراب و حوالہ کے درج کرتے ہیں اور بعض اوقات شانِ نزول بھی بیان کرتے ہیں۔
- احادیث رسول درج کرتے ہیں تو اسی پر کلام ہونے کی صورت میں وہ بھی درج کر دیتے ہیں۔ حدیث کو کبھی بغیر حوالے کے بھی درج کر دیتے ہیں۔
- روایات سیرت اور تاریخی واقعات بیان کرتے ہیں تو قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور کتاب سیرت و تاریخ کی روشنی میں جانچ پڑتال کر کے بیان کرتے ہیں۔
- کسی واقعۂ سیرت سے اگر کسی فقہی حکم یا مسئلہ کا پتہ چلتا ہو تو باقاعدہ اسکا استنباط کرتے ہیں اور ائمہ اربعہ کی آراء واختلاف بھی درج کرتے ہیں۔ اور اگر کسی اختلافی مسئلے میں کوئی نتیجہ نکل سکتا ہو تو نتیجہ بھی کرتے ہیں۔
- کسی مسئلے میں اگر کوئی ذاتی اجتہاد ہو تو وہ بھی بیان کر دیتے ہیں اور ساتھ دلیل بھی درج کرتے ہیں۔
- مشکل الفاظ کی وضاحت اور اضافی معلومات کو حواشی میں مہیا کر دیتے ہیں۔

خلاصہ بحث

کتاب اصح السیر کا انداز بیان سادہ اور آسان فہم ہے۔ اصح السیر میں قرآن، حدیث، تفسیر، کتب تاریخ، کتب احادیث، کتب فقہ، ائمہ حدیث اور ائمہ فقہاء کی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔ المختصر یہ کہ اصح السیر مولانا عبد الرؤف دانا پوری کی علمی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۳۔ اصح السیر کا اسلوب و منہج

اصح السیر میں مولانا عبد الرؤف داناپوریؒ نے وقائع سیرت سے فقہی مسائل کے استنباط اور اس کے بیان میں اختیار کردہ اسلوب و منہج کے نمایاں پہلو درج ذیل ہیں۔

ا۔ قرآن مجید سے استدلال:

واقعاتِ سیرت سے فقہی مسائل کے اخذ و استنباط اور فقہی مباحث کا اکثر و بیشتر مصنف نے قرآنی شہادتوں سے استدلال کیا ہے۔ جس سے ان مسائل کی فقہی حیثیت کی مضبوطی میں اضافہ ہوتا ہے۔

بطور مثال: مال فئ کسے کہتے ہیں اس مسئلہ کی تحقیق میں استشہاداً قرآن کی آیت [1] پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

ا۔ الحشر: ۵۹/۶

نے بھی بنی نضیر کے مال کو فئ کہنے کی بھی یہی وجہ بتائی ہے۔[1] اسی طرح فئ کے مصارف کو بیان کرنے کے لیے بھی قرآن کی آیت[2] سے استدلال کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس آیت میں خمس کے جتنے مصارف ہیں ان تمام کو فئ کے مصارف بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی عام کیا گیا ہے یعنی کہ قیامت تک جتنے بھی لوگ مسلمان ہوں سب کا مالِ فئ میں حق ہے۔[3]

۲۔ احادیثِ نبویہ سے استدلال کا طریقہ:

اصح السیر کے مباحث فقہیہ کا مطالعہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصنف نے واقعاتِ سیرت سے مسائل کے استنباط میں احادیث سے استدلال کو اولیت دی گئی ہے۔ اسی لیے ہر فقہی بحث میں احادیث نبوی جابجا نظر آتی ہیں۔ جو کہ ائمہ فقہاء کا واضح اسلوب ہے۔ دوسری بات جو باقی فقہاء سے مختلف ہے وہ یہ ہے مصنف احادیث سے استدلال میں ایک سے زائد اسالیب اپناتے ہیں۔

۱. اوّل تو حدیث اس صورت میں لاتے ہیں کہ ایک مسئلہ میں کسی امام کی رائے اور موقف بیان کیا اور انہوں نے خود اپنی رائے کے جواز میں کوئی حدیث استشہاداً بیان کی ہوئی تھی تو وہ حدیث ان کے موقف کی دلیل کے تحت آگئی۔

بطور مثال: شہید کی نماز جنازہ کے بارے میں ائمہ حضرات کا اختلاف ہے کہ پڑھنی چاہیے کہ نہیں۔ امام مالک و امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ منع ہے اور وہ اپنے موقف کو اس حدیث سے ثابت کرتے ہیں کہ غزوۂ احد کے متعلق حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء احد کو بلا غسل ان کے اپنے لباس میں صلوٰۃ الجنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا۔

جبکہ اس بحث میں صلوٰۃ الجنازہ کے قائل حضرات اپنے موقف پر دوسری حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل صلوٰۃ الجنازہ پڑھنے کا ہے۔[4]

۲. حدیث لانے کا دوسرا اسلوب یہ اپناتے ہیں کہ مصنف خود کسی امام کی رائے کو ترجیح دینے کے لیے استدلال کے طور پر کوئی حدیث لاتے ہیں کہ ترجیح کی وجہ یہ حدیث ہے میری ذاتی رائے نہیں۔ یا کسی کے موقف کا رد کرنا ہو تو بھی ایسی حدیث لاتے ہیں جو اس موقف کو رد کرتی ہو۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۳۵

۲۔ الحشر:۵۹/۸-۹

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۳۷

۴۔ ایضاً، ص:۱۹۰

بطور مثال: حکم اراضیٔ مکہ اور مکانات مکہ کے کسی کی ملکیت میں ہونے یا نہ ہونے کی اختلافی بحث میں مصنف ان ائمہ کے مؤقف کو ترجیح دیتے ہیں جو اراضیٔ و مکانات مکہ کے کسی کی ملکیت نہ ہونے کے قائل ہیں۔ اور اپنی اس ترجیح کی وجہ بیان کرنے کے لیے اس حدیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص بیوت مکہ کا کرایہ کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔(۱)

۳. تیسرا اسلوب حدیث لانے کا یہ ہے کہ مصنف کسی واقعہ حدیث سے خود کسی فقہی مسئلے کا استنباط کرتے ہیں پھر اپنے موقف کی دلیل کے طور پر حدیث لاتے ہیں۔

بطورِ مثال: فیٔ کے اموال کا نتیجہ اخذ کرنے کے لیے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کہ "انبیاء ورثاء نہیں چھوڑتے وہ جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے" سے استدلال کرتے ہوئے نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ فیٔ کے اموال پر وصیت یا وراثت نہیں ہو سکتی۔(۲)

۳۔ تعاملِ صحابہ واسلاف سے استدلال:

مصنف مباحث فقہیہ کے استدلال میں کبھی صحابہ واسلاف کے تعامل سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

بطور مثال: مباہلہ کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص نہ ہونے کی دلیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا عمل نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی ایک مرتبہ اپنے مخالفین کو مباہلہ کی دعوت دی۔ اسی طرح امام اوزاعی نے بھی سفیان ثوری کو رفعہ یدین کے مسئلہ میں مباہلہ کی دعوت دی۔(۳)

۴۔ ائمہ فقہاء کی آراء واختلاف اور ان کے دلائل بیان کرنا:

فقہی مباحث کے بیان میں ائمہ فقہاء کی آراء واختلافات اوران کے دلائل کو بیان کرنے میں اور ان سے استدلال کی صورت میں بھی مصنف ایک سے زائد اسالیب اختیار کرتے ہیں۔

- **پہلا اسلوب:**

کبھی آیاتِ قرآنی سے استدلال کرتے ہیں اور کبھی احادیث مبارکہ یا اجماع و قیاس سے اس اسلوب کے تحت کبھی کسی فقہی مسئلے کے تحت تمام ائمہ کی آراء کو درج کر دیتے ہیں۔ تاکہ قارئین اس مسئلہ کے بارے میں تمام ائمہ کی آراء کو جان لیں پھر جس کی چاہیں تقلید کریں۔

بطورِ مثال: اسلاب کے حکم میں ائمہ کا اس پر بڑا اختلاف ہے کہ مقتول کے سلب کا مال ہر صورت میں قاتل کا ہے

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۴۲

۲۔ ایضاً، ص: ۴۳۸

۳۔ ایضاً، ص: ۵۰۰

یا اس کے لیے شرط ہے کہ امام پہلے اعلان کرے کہ مقتول کا سلب قاتل کا ہو گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ حضور ﷺ کی سیرت کے ایک واقعہ جس میں حضور ﷺ نے جنگ کے بعد اعلان کیا کہ "مقتول کا سلب قاتل کا ہے" اور ایک صحابی کے تقاضا کرنے پر کہ میں نے فلاں کافر کو قتل کیا لہٰذا اب اس کا سلب مجھے ملنا چاہیے ، ان کو مقتول کا سلب دلوا دیا، سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ امام پہلے اعلان کرے یا نہ کرے، مقتول کے سلب کا مال قاتل کا ہی ہے۔ اور سلب اصل غنیمہ میں سے ہوتا ہے خمس میں سے نہیں۔

جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں اختلاف ہے، ان کے نزدیک امام کا پہلے اعلان کرنا شرط ہے اور یہ بھی کہ وہ مال خمس میں سے ہو گا اور یہ حضرات اپنے موقف پر قرآن کی آیت "واعلموا انّما غنمتم" سے استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا ہے کہ خمس کے سوا بقیہ غنیمت سب غانمین کی ہے اور غانمین کے حق کو بغیر ان کی اجازت کے امام کسی کو نہیں دے سکتا۔ اس لیے سلب کا حکم نفل کا ہے اور خمس میں سے ہو گا۔ (۱)

- **دوسرا اسلوب:**

ائمہ کے اختلافات درج کرنے کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ کسی مسئلے پر تمام ائمہ کی صرف رائے درج کرتے ہیں جبکہ جس امام کی رائے مضبوط ہو اس کی رائے کی تفسیر بھی درج کر دیتے ہیں۔

بطورِ مثال: خمس کے مال کو مصارفین پر کیسے تقسیم کیا جائے اس پر ائمہ اربعہ کی آراء میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خمس اور زکوٰۃ کے جن مصارف کا ذکر قرآن میں ہے اس مال کو اس کے تمام مصارف میں برابر تقسیم کرنا ضروری ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی بلکل ضرورت نہیں بلکہ جس مصرف میں جیسی حاجت ہو ویسا صرف کیا جائے حتیٰ کہ ایک ہی مصرف میں کل مال کو صرف کرنا بھی جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے زکوٰۃ میں تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مثل ہی ہے اور خمس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مثل ہے۔ (۲)

- **تیسرا اسلوب:**

صنف کا یہ ہے کہ اختلاف درج کرنے کی بجائے صرف بتا دیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے اور اختلاف درج نہیں کرتے۔

بطورِ مثال: متفرقات کی زکوٰۃ کے بارے میں اختلاف پر صرف یہ کہتے ہیں کہ "متفرقات کی زکوٰۃ کے بارے

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۴۳۰-۴۳۲

۲۔ ایضاً، ص: ۴۳۲

میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ متفرقات کی زکوٰۃ بھی اس حساب سے لی جائے اور بعض کہتے ہیں کہ متفرقات کی زکوٰۃ معاف ہے۔"(۱)

۵۔دیگر وقائع سیرت اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے استدلال:

مصنف اپنی کتاب اصح السیر میں مباحث کے بیان کرنے میں سیرت کے دیگر واقعات اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔مولانا کا یہ اسلوب مسائل کے استنباط اور اس کی حکمتیں سمجھنے میں سہولت دیتا ہے۔

بطورِ مثال: شہید کو اس کے مقتل میں ہی دفن کرنا چاہیے۔اس حکم کی حکمت ظاہر کرنے کے لیے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد اور ماموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے احد کی جنگ کے بعد وہیں ان کے مقتل میں دفن کیا۔لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں انہیں خبر ہوئی کہ ان کے والد کی قبر کھل گئی ہے۔انہوں نے جا کر دیکھا تو جس طرح ان کو دفن کیا تھا بلکل اسی طرح تھے کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔اس کے بعد سے قاعدہ ہو گیا کہ شہید کو اس کے مقتل میں ہی دفن کیا جائے۔(۲)

مکہ کی اراضی اور مکانات کسی کی ملکیت نہیں اور اس کے انتفاع سے بھی کسی کو روکنا جائز نہیں۔اس مسئلے کے تحت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے امیر مکہ کو لکھا کہ بیوتِ مکہ کو کرایہ پر نہ دیا جائے انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے اہلِ مکہ کو مکانات میں دروازہ لگانے سے منع کیا۔(۳)

۶۔اقوالِ صحابہ وفقہاء میں ترجیح ورد:

مصنف بعض اوقات مباحث فقہیہ کے بیان کرنے میں جب اقوال صحابہ وفقہاء سے استدلال کرتے ہیں تو کسی ایک امام کی رائے کو دوسرے ائمہ کی آراء پر ترجیح دیتے ہیں۔اور دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ ترجیح کسی ذاتی رائے کی بناء پر نہیں بلکہ اس امام کے دلائل کی مضبوطی کی بناء پر ہے۔

بطورِ مثال: شہید کو اس کے کفن میں ہی دفن کرنے کے حکم کی فقہی حیثیت کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ یہ حکم علیٰ سبیل الوجوب تھا یا علیٰ سبیل الاستحباب والاولیٰ تھا۔مصنف اس سلسلے میں ائمہ کا اختلاف نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول وجوب کا ہے۔جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک استحباباً تھا۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۶

۲۔ ایضاً، ص:۱۹۲

۳۔ ایضاً، ص:۳۴۱

اس کے بعد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے ابنِ قیم کا قول نقل کرتے ہیں۔ جس میں وجوب کے قول کو ترجیح دینے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ کہ "ابنِ قیم کہتے ہیں کہ اظہر اور موافق سنت قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے دو کفن بھیجے ایک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیا گیا اور ایک دوسرے شہید صحابی رضی اللہ عنہ کو۔ اگر اسی کپڑے میں دفن کرنا واجب ہوتا تو یہ نہ دیا جاتا، یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کفار نے مثلہ کیا تھا۔ اس لیے مجبوراً ان کو دوسرا کفن دینا ضروری ہو گیا تھا۔ جو بغیر ایسے عذر کے جائز نہیں۔ [۱]

۷۔ متعارض روایات میں تطبیق:

جب کسی بحث میں ایک جیسی دو روایات ایک دوسرے کے متعارض ہوں تو مصنف نے ان کے درمیان مطابقت کرنے کی کوشش کی ہے۔

بطورِ مثال: فجر میں قنوت پڑھنے اور نہ پڑھنے کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہی دو متضاد روایتیں ہیں۔ جن میں تطبیق کے لیے ابن قیم کا قول نقل کرتے ہیں کہ "حضرت انس بن مالک اس باب میں متعدد روایات ہیں اور بظاہر ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتی ہیں مگر صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اختلاف باقی نہیں رہتا۔ فقہاء خاص دعاء کو قنوت کہتے ہیں جبکہ بعض تعدیل ارکان اور طول قیام کو قنوت کہتے ہیں۔ اور کبھی قنوت میں خاص دعاء کا ذکر بھی کرتے تھے۔ اس فرق کو پیش نظر رکھ کر تمام روایتوں کو دیکھیں تو کچھ اختلاف باقی نہیں رہتا۔"[۲]

۸۔ فقہی اصولوں کا اطلاق:

مصنف بعض مباحث میں فقہی اصولوں اور ظابطوں کا اطلاق بھی کرتے ہیں جس سے مباحث فقہیہ کی حیثیت بلند ہوتی ہے۔

بطورِ مثال: صاحب اصح السیر نکاح محرم کی بحث میں مکمل اختلاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ الغرض دونوں جانب روایت صحیحہ موجود ہیں، وہاں اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سنداً راجح ہے لیکن خود ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ جب اختلاف دائر ہو منع اور جواز میں تو حکم منع پر ہو گا، کیونکہ اسی میں احتیاط ہے۔[۳]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۰

۲۔ ایضاً، ص:۲۰۲

۳۔ ایضاً، ص:۳۰۳

۹۔ ناسخ و منسوخ کی نشاندہی کرنا:

مصنف کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اس کے ناسخ و منسوخ کی نشاندہی کے ساتھ اس میں اختلاف کی صورت اور اختلاف کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں۔

بطورِ مثال: خیبر کے احکام میں سے ایک یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَهْرِيقُوهَا وَاكْسِرُوهَا. فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَوْ نُهَرِيقُهَا وَنَغْسِلُهَا قَالَ:أَوْ ذَاكَ))[1]

ترجمہ: گوشت پھینک دو اور برتن توڑ دو۔ مگر ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ اگر گوشت پھینک دیا جائے اور برتن دھو دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اچھا دھو دو"

پہلا حکم عمل سے قبل ہی منسوخ ہو گیا۔ اور معلوم ہوا برتن کی نجاست دھونے سے زائل ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ مجروح راویوں روایات کے ضعف کی نشاندہی:

مباحث فقہیہ میں جب کبھی احادیث بطور استدلال لائی جاتی ہیں تو اس سلسلے میں مصنف ان احادیث و روایات کی صحت پر کیا گیا کلام درج کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور کسی روایت میں اگر کوئی ضعف ہو تو اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ راویوں کی ثقاہت پر بحث کرتے ہیں کہ فلاں راوی پر فلاں نے جرح کی ہے یا فلاں منکر الحدیث ہے۔

بطورِ مثال: شہید کی نماز جنازہ کی بحث میں احناف علماء کا موقف نمازِ جنازہ کے واجب ہونے کا ہے۔ باقی ائمہ سے اختلاف کے دلائل میں مصنفؒ اصحاب سیر سے منقول کرتے ہیں کہ حاکم کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت لاتے ہیں اور روایت پر ابن ہمام کا اضافہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ گو بعض رواۃ پر جرح ہوئی ہے مگر مختار توثیق ہے اور بہر حال درجہ حسن سے نازل نہیں ہے۔"[2] اسی طرح ان روایات کے ساتھ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت درج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "مانعین کہتے ہیں کہ ان سب روایتوں پر کلام ہے اور سب کی سند مجروح ہے صرف عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح ہے۔"[3] اس بحث کے تحت مزید لکھتے ہیں کہ "احناف کہتے ہیں کہ ان روایات کی سندیں درجہ حسن سے نازل نہیں ہیں اور حدیث حسن قابلِ استدلال ہے خصوصاً جب متعدد طریقہ سے تضاد موجود ہے اس کے علاوہ یہ حدیثیں مثبت ہیں۔"

۱۱۔ استنباط احکام کے ضمن میں لغوی و نحوی توضیح:

مصنف نے مباحث فقہیہ کے بیان میں جابجا مشکل الفاظ کی توضیح بھی کی ہے۔ جس سے پڑھنے والے کو مسائل

۱۔ بخاری، صحیح مسلم، کتاب الصيد والذبائح، باب تَحْرِيمِ أَكْلِ لَحْمِ الْحُمُرِ الإِنْسِيَّةِ، حدیث:۵۱۳۰، ص:۶/۶۵

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۰-۱۹۲

۳۔ ایضاً، ص:۱۹۰-۱۹۲

سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

بطورِ مثال: مصنف جب کسی مسئلہ پر باب باندھتے ہیں تو باب میں ہر موضوع شروع کرنے سے پہلے اس کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً مالی معاملات پر باب باندھتے ہوئے زکوٰۃ کے معنیٰ یوں لکھتے ہیں۔ "زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ "نمو" کے ہیں۔ زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس سے مال کا تحفظ اور نمو ہوتا ہے۔"(۱)
اسی طرح غنائم، فیئی، خمس، عشر، جزیہ، خراج، اسلاب اور اموالِ مجورہ وغیرہ کے احکام سے پہلے ان معنیٰ و مفہوم لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔(۲)

نکاحِ محرم کی فقہی بحث میں محرم کے ایک سے زائد معنیٰ ہونے کی وجہ سے اختلاف کی صورت میں رفعِ اختلاف کے لیے اس کی معنوی توضیح کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ " حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا تو محرم تھے" اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ حالتِ احرام میں تھے بلکہ جو بھی شخص شہرِ حرام یا بلدِ حرام میں ہو اس کو محرِم کہتے ہیں۔ اور چونکہ عقد شہرِ حرام میں ہوا اس لیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محرم کہا۔"(۳)

12۔ غلط فہمیوں کا ازالہ:

مباحثِ فقہیہ کے بیان کرنے میں مصنفؒ نے یہ طریقہ بھی اپنایا ہے کہ بعض فقہی مباحث جن میں علماء یا سمجھنے والے کسی پہلو کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں آپ اس غلط فہمی کی نشاندہی کرکے اس کی تصحیح بھی کر دیتے ہیں۔

بطورِ مثال: حجاب کی بحث کے بیان میں حجاب کی مخالفت میں پیش کیے جانے والے دلائل کے بارے میں کہتے ہیں کہ "حجاب کی بحث میں ایک بڑی غلطی یہ ہوئی ہے کہ حجاب کے حکم سے پہلے جو عورتیں باہر نکلا کرتی تھیں اس کو حجاب کے خلاف استدلال میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ یا لونڈیاں نکلا کرتی تھیں اس کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ بدوی قبائل محرّفہ عورتیں نکلا کرتی تھیں اور اپنا معاش خود حاصل کرتی تھیں ان کے معاش کا ذریعہ ان کا پیشہ تھا اس لیے وہ معذور تھیں مگر اس کو استدلال کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے۔ بنی غفار کی کچھ عورتیں مرہم پٹی کرنا جانتی تھیں اس لیے فوج میں شامل ہو جایا کرتی تھیں یہ عورتیں خیبر بھی گئی تھیں۔ روانگی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہ ہوا۔ بعد میں جب معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے آنے پر ناخوش ہوئے۔ مگر چونکہ جا چکی تھیں اس لیے فوج کے ساتھ رہیں۔ مگر کیا اس کی وجہ سے حجاب کا حکم باطل ہو جائے گا۔ اور جو شریف اور شوہر والی عورتیں

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۶

۲۔ ایضاً، ص:۴۲۲

۳۔ ایضاً، ص:۳۰۱

ہیں اور معاش اور نفقہ حاصل کرنے کے لیے مجبور نہیں ہیں کیا ان کو بھی اجنبی کے سامنے منہ دکھانا جائز ہے"[1]

خلاصہ بحث

اصح السیر کا اسلوب اس کتاب کی خوبصورتی اور اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔ ذیل میں مندرجہ بالا بحث کو نکات کی شکل میں بیان کیا جارہا ہے۔

- اصح السیر میں مولانا فقہی مسائل کا استنباط وقائع سیرت سے کرتے ہیں۔
- اس ضمن میں قرآنی آیات سے استدلال بھی کرتے ہیں۔
- قرآنی آیات کے علاوہ احادیث مبارکہ بھی بطور استدلال لاتے ہیں۔ اس ضمن میں دو طرح کے طریقہ کار اپناتے ہیں۔

اول: یہ کہ فقہی اختلاف کی صورت میں ائمہ فقہاء وعلماء نے کوئی حدیث بطور استدلال بیان کی ہو، اسے درج کرنا۔

دوئم: یہ کہ خود بطور استدلال حدیث لانا۔

- جن روایات میں کوئی ضعف ہو یا جن راویوں پر جرح کی گئی ہو اس کا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔
- فقہی مباحث کے بیان میں صحابہ کے تعامل اور صحابہ کے اقوال سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔
- بعض اوقات صحابہ وفقہاء کے اقوال میں ترجیح اور رد بھی کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ترجیح یا تردید کی وجہ بھی بیان کر دیتے ہیں۔
- دیگر واقعات سیرت کو بطور استدلال پیش کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔
- ائمہ فقہاء وعلماء فقہ کے اختلاف اور ان کے دلائل کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ جس سے کتاب کا فقیہانہ رنگ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔
- فقہی مسائل کے استنباط اور مباحث کے ضمن میں بعض اوقات فقہی اصولوں کا اطلاق بھی کرتے ہیں۔
- فقہی مباحث کے بیان میں اگر دو ایسی روایات آجائیں جو ایک دوسرے کے مخالف ہوں تو تطبیق ممکن ہونے کی صورت میں تطبیق کر دیتے ہیں۔
- کسی فقہی بحث یا مسئلہ کے حوالے سے اگر کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہو تو اس کی نشاندہی کر کے اس کی تصحیح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
- فقہی مسائل میں ناسخ ومنسوخ کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔
- مشکل الفاظ کی لغوی ومعنوی توضیح بھی کر دیتے ہیں۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۶۷

خصوصیات وامتیازیات:

اصح السیر کی درج ذیل خصوصیات کو نکات کی شکل میں بیان کیا جارہا ہے۔

- اصح السیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سیرت کی یہ کتاب خالص فقہی انداز میں لکھی گئی ہے اور اس کا یہ انداز باقی سیرت کی کتابوں سے مختلف اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔
- اصح السیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں داناپوریؒ نے واقعات سیرت کو صحیح روایات کی روشنی میں ذکر کیا ہے۔ جبکہ باقی سیرت نگاروں نے اپنی کتب میں واقعات سیرت کو ترتیب سے ذکر کرنے کے لیے ضعیف روایات کا سہارالیا ہے۔
- مولاناعبدالرؤف داناپوری چونکہ فکری لحاظ سے فقہ حنفی کے پیروکار تھے اس لئے ترجیح وتردید کی صورت میں اکثر اوقات فقہ حنفی ہی کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ لیکن دوسرے مذاہب سے بھی خاصی واقفیت کی بناپر اسلوب یہ رکھا ہے کہ آراءواستدلال تمام مذاہب کے لئے یکساں طور پر نقل کرتے ہیں ایسانہیں کرتے کہ صرف فقہ حنفی ہی کے رائے ظاہر کریں۔ جیسے خیبر کی زمین کسی تقسیم میں صاحب اصح السیر نے جمہوراور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو پسند کیا ہے۔
- اصح السیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ صاحب کتاب اس میں جب کوئی دوسراموضوع شروع کرتے ہیں تو اس کے تعارف کی غرض سے اس کے معانی و مفاہیم واضح کر دیتے ہیں مثلاً کتاب الاموال میں زکوۃ کے معنیٰ و مصارف بیان کرتے وقت خاص عربی اصطلاحات کی توضیح کر دیتے ہیں۔
- اصح السیر میں ایک خاص بات یہ ہے کہ صاحب اصح السیر نے اس میں سماجی اور معاشرتی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے مثلاً حجاب کی فقہی بحث میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ حجاب کے حکم سے پہلے عورتوں کے باہر نکلنے کے واقعات سے استدلال کرتے ہوئے آج کی عورتیں جن کو معاش کی مجبوری بھی نہیں ان کو باہر نکلنے کی اجازت دینا غلط ہے۔ اس لیے کہ اس سے تو حجاب کا حکم باطل ہو جائے گا۔ [۱]
- صاحب اصح السیر احادیث سے استدلال کرنے میں وہ خاص بات جو باقی فقہاء سے مختلف ہے وہ یہ ہے مصنف احادیث سے استدلال میں ایک سے زائد اسالیب اپناتے ہیں۔ اوّل تو حدیث اس صورت میں لاتے ہیں کہ ایک مسئلہ میں کسی امام کی رائے اور موقف بیان کیا اور انہوں نے خود اپنی رائے کے جواز میں کوئی حدیث استشہاداً بیان کی ہوئی تھی تو وہ حدیث ان کے موقف کی دلیل کے تحت آگئی۔ دوسرا اسلوب حدیث لانے کا یہ اپناتے ہیں کہ مصنف خود کسی امام کی رائے کو ترجیح دینے کے لیے استدلال کے طور پر کوئی حدیث لاتے ہیں کہ ترجیح کی وجہ یہ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۶۶۷

حدیث ہے میری ذاتی رائے نہیں۔ یا کسی کے موقف کا رد کرنا ہو تو بھی ایسی حدیث لاتے ہیں جو اس موقف کو رد کرتی ہو۔ تیسرا اسلوب حدیث لانے کا یہ ہے کہ مصنف کسی واقعہ حدیث سے خود کسی فقہی مسئلے کا استنباط کرتے ہیں پھر اپنے موقف کی دلیل کے طور پر حدیث لاتے ہیں۔ ان تمام کی مثالیں اوپر اسلوب میں گزر چکی ہیں۔

- صاحب اصح السیر نے اپنی کتاب میں ائمہ اربعہ کی آراء واختلافات کے بیان میں متعدد مقامات پر متعدد طرق اپنائے ہیں۔ اوّل یہ کہ جب کسی فقہی نقطہ پر ان کی آراء واختلاف کا ذکر کرتے ہیں تو کسی امام کا کسی دوسرے امام کی رائے کی تردید کی دلیل کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً اسلاب کے حکم میں ائمہ کا اختلاف اور ان کے دلائل کا بیان ۔[1] اسی طرح شہید کی نماز جنازہ کی بحث میں احناف کا شوافع حضرات کی تردید میں دلیل کا ذکر کرتے ہیں ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس امام کی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہے اس کو ترجیح دیتے ہیں اور اس مسئلے کا حکم انہیں کی رائے کے مطابق لگاتے ہیں۔ مثلاً شہید کے کفن کی بحث میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔[2] تیسرا طریقہ یہ ہے کہ صرف ائمہ کی آراء ذکر کر دیتے ہیں یا صرف اتنا بتا دیتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ائمہ کا اختلاف ہے اور اختلاف ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً متفرقات کی زکاۃ کے مسئلے میں یہی نوعیتِ بیان ہے۔[3]

خلاصہ بحث

مولانا عبد الرؤف دانا پوری کہ ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ باوجود فکری لحاظ سے فقہ حنفی کے پیروکار ہونے کے ان کا ترجیح ورد کا انداز معتدل ہے۔ اور آپ نے سماجی اور معاشرتی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔

۱۔ دانا پوری، اصح السیر، ص:۴۲۶

۲۔ ایضاً، ص:۱۹۰

۳۔ ایضاً، ص:۴۱۶

باب دوم

غزوات و سرایا میں پیش آمدہ عمومی مسائل و احکام

فصلِ اول: شہداء کی تجہیز و تکفین کے مسائل

فصلِ دوم: زکوٰۃ اور غنائم کے و مسائل

فصلِ سوم: متفرق مسائل

اصح السیر کی فقہی مباحث کا تعارف

صاحب اصح السیر نے فقہی مباحث کے بیان میں بنیادی طور پر دو قسم کے طریقے اپنائے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ وقائع سیرت سے فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے، جو کہ فقہ السیرۃ کا عام اسلوب ہے۔ دوسرا یہ کہ فقہی معاملات مثلاً مالی معاملات پر ایک باب ترتیب دیا، پھر اس باب میں باقاعدہ ان معاملات پر تفصیلی گفتگو کی اور اس کے تحت استدلال کے طور پر سیرت کو بیان کیا مثلاً کتاب الاموال، کتاب الوفود وغیرہ۔

اصح السیر میں جن فقہی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے یا جن فقہی مباحث کا ذکر آیا ہے ان میں غزوۂ احد کے تحت شہداء کی تجہیز و تکفین اور تدفین کی فقہی بحث، غسل اور صلوۃ الجنازہ کی فقہی بحث، قنوت نازلہ اور قنوت فی الفجر کا بیان، عکل و عرینہ کے واقعہ کے تحت متعدد سزاؤں کا جمع کرنا اور جانور کا پیشاب پینے کی شرعی حیثیت کا بیان ہے۔ غزوۂ خیبر کے تفصیلی واقعات کے تحت مال غنیمت کی اراضی اور گھوڑوں کی تقسیم کی بحث، مخابرہ، ممنوعات خیبر، حقوق، قتال شہر حرام، تحریم اللحوم الحمر اہلیہ اور طہارت کی فقہی بحث اور متعہ کا حکم جو خیبر کے واقعات کے علاوہ فتح مکہ کے تحت بھی بیان کیا گیا ہے۔ نکاح محرم کی فقہی بحث، مکہ کی اراضئ و مکانات کا حکم، قصر صلاۃ، قضاء علی الظاہر کا حکم، صدقہ علی البشارۃ کی فقہی بحث کا بیان۔ کتاب الاموال کے باب کے تحت صدقات کے احکام، خمس کا حکم، غیر منقولات اور فئ کے اموال کا حکم، جزیہ کا حکم، ہدایہ و تحائف کا حکم، اموال مہجورہ اور عشر و خراج کے حکم کا بیان ہے۔ اس سے آگے کے مسائل میرے مقالہ کے موضوع کا حصہ تو نہیں ہیں لیکن ان کا بھی اجمالاً تذکرہ کر دیتا ہوں۔ جیسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حج کے واقعات کے تحت معاہدہ کی قسمیں اور ان سب کے حکم کا بیان ہے۔ کتاب الوفود کے تحت آنے والی فقہی مباحث میں مباہلہ، ربوا، خوراک، عاریۃ کا حکم، غنم ضالہ کا حکم اور جنگ میں اذان، اقامت، وضو اور جماعت کے بعض مسائل کا بیان ہے۔ کتاب حجۃ الوداع کے تحت حج و عمرہ کے بعض مسائل کی فقہی بحث اور ولیمہ و حجاب کا حکم اور اسکی فقہی بحث ہے۔ حجاب یعنی پردۂ شرعی کے تفصیلی حکم کے ساتھ اصح السیر کی فقہی مباحث کا اختتام ہوتا ہے۔

چونکہ اس مقالہ کا موضوع غزوات و سرایا کے تحت بیان کیے گئے فقہی مباحث سے متعلق ہے تو اس لیے سب سے پہلے غزوۂ احد کے تحت بیان ہونے والے فقہی مسائل کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

فصل اول

شہداء کی تجہیز اور تکفین کے مسائل

انبیاء علیہم السلام و صدیقین کے بعد سب سے بڑا مرتبہ شہداء کرام کا ہے۔ غزوۂ احد میں تقریباً ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے اور چونکہ شہداء کی تجہیز و تکفین اور غسل کے احکام عام لوگوں سے مختلف ہیں اور ان مسائل کا استخراج بھی واقعات غزوۂ احد سے ہی کیا گیا ہے۔ لہٰذا شہید کی تجہیز و تکفین کے متعلق اس حدیث کے تحت صاحب اصح السیر نے چند مسائل کو ان کے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان مندرجہ ذیل مسائل کو ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۔ شہداء کو غسل دینا:

یحیی بن عباد بن عبد اللہ (بن زبیر) اپنے والد سے وہ ان کے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حنظلہ بن ابی عامر رضی اللہ عنہ کے قتل کے وقت فرمارہے تھے:

((إنَّ صاحِبَكُم تَغسِّلُه المَلائكةُ، فاسألوا صاحِبَتَه". فقالَت: خَرَجَ وهو جُنُبٌ لَمّا سَمِعَ الهائعَةَ. فقالَ رسولُ اللهِ صلي الله عليه وسلم:"لِذَلِكَ غَسَّلَته المَلائكةُ)) [۱]

ترجمہ: "تمہارے ساتھی کو فرشتے غسل دے رہے تھے۔ لوگوں نے اس کی بیوی سے پوچھا تو اس نے کہا: جب اس نے اعلان سنا تو یہ جنبی حالت میں باہر چلا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی وجہ سے فرشتے اسے غسل دے رہے تھے۔"

صاحب اصح السیر نے اس حدیث کے تحت شہید کے متعلق فقہی مسائل کو بیان فرمایا ہے۔

ائمہ اربعہ، اربابِ سیر اور اصحابِ حدیث سب اس بات پر متفق ہیں کہ شہداء کو غسل نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے کہ کسی بھی غزوہ میں بھی شہداء کو غسل نہیں دیا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منع ثابت ہے۔ یہاں تک مسئلہ متفق علیہ ہے۔

اب اگر اس بات پر علم ہو جائے کہ صحابی بوقتِ شہادت حالتِ جنابت میں تھے تو اس صورت میں اختلاف ہے کہ غسل دینا چاہیے کہ نہیں؟۔ اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں غسل دینا واجب ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں غسل نہ دیا جائے۔ وجوبِ غسل کی دلیل وہی حدیث ہے جو کہ اوپر گزر چکی ہے جس میں ہے کہ چونکہ مسلمانوں کو علم نہیں تھا اس لیے حضرت حنظلہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو فرشتوں نے غسل دیا۔

۱۔ بیہقی، احمد بن علی بن موسی ابو بکر البیہقی، سنن الکبریٰ، مکتبہ دار الباز، مکہ المکرمہ، ۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۴ء، کتاب الجنائز، باب الجنب يستشهد في المعركة، حدیث: ٦٦٠٥، ص: ۴/ ۱۵، (حدیث حسن)

صاحب اصح السیر احناف کی طرف سے مانعین کے جواب میں کہتے ہیں کہ آپ کا یہ کہنا بلکل بھی صحیح نہیں کہ اگر واجب ہوتا تو حضور ﷺ خود غسل دیتے اس لیے کہ جب ملائکہ کے غسل سے طہارت ہو گئی تو پھر دوبارہ غسل کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔(۱)

۲۔ شہداء کو کفن دینا:

شہید کو اس کے کفن میں ہی دفن کرنے کے حکم کی فقہی حیثیت کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ حالانکہ اس بات میں تمام ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ شہدائے احد کو حضور ﷺ نے ان کے اپنے لباس میں ہی دفن کیا، جدید کفن نہیں دیا گیا۔

مگر اختلاف اس بات میں ہے کہ شہداء کو اسی کپڑے میں دفن کرنا علیٰ سبیل الوجوب تھا یا علیٰ سبیل الاستحباب ولاولویہ؟ صاحب اصح السیر اس سلسلے میں ائمہ کا اختلاف نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول وجوب کا ہے۔ جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک استحباباً تھا۔(۲)

اس کے بعد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں۔ جس میں وجوب کے قول کو ترجیح دینے کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ ابنِ قیم کہتے ہیں کہ:

> "اظہر اور موافق سنت قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے دو کفن بھیجے ایک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیا گیا اور ایک دوسرے شہید صحابی کو۔ اگر اسی کپڑے میں دفن کرنا واجب ہوتا تو یہ نہ دیا جاتا، یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کفار نے مثلہ کیا تھا۔ اس لیے مجبوراً ان کو دوسرا کفن دینا ضروری ہو گیا تھا۔ جو بغیر ایسے عذر کے جائز نہیں۔"(۳)

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مصنف احناف کے دلائل کو قوی سمجھتے ہوئے احناف کے موقف کو اختیار کرتے ہیں۔ اور پھر احناف کے مذہب کی تائید میں صاحب اصح السیر حضور ﷺ کے اس فرمان کہ: "شہداء کو ان کے خون کے ساتھ دفن کرو" سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

> "شہداء کو جدید کفن کی بجائے اسی کپڑے میں دفن کیا جائے جو بوقتِ جہاد زیبِ تن کیے ہوئے ہوں اور نہ غسل دیا جائے کیونکہ سنتِ رسول ﷺ یہی ہے۔"(۴)

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۰

۲۔ ایضاً: ص:۱۹۰

۳۔ ابن قیم، زاد المعاد، ص:۳/۱۹۵

۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۰

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب اصح السیر اس مسئلہ میں احناف کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔ کہ شہداء کو انہیں کپڑوں میں دفن کرنا چاہیے جو بوقت شہادت زیب تن ہوں۔

۳۔ شہداء کی نمازِ جنازہ:

شہید کی نماز جنازہ کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے کہ پڑھنی چاہیے کہ نہیں۔ امام مالک و امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ منع ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واجب کہتے ہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بعض قول سے استحباب بھی معلوم ہوتا ہے۔[1] پھر شافعیہ میں اس بات میں اختلاف ہے کہ منع سے مراد حرام ہے یا عدمِ وجوب۔ اور وہ اپنے موقف کو اس حدیث سے ثابت کرتے ہیں کہ:

((أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ. فَإِذَا أُشِيرَ لَهُ إِلَى أَحَدِهِمَا قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ، وَقَالَ: أَنَا شَهِيدٌ عَلَى هَؤُلَاءِ. وَأَمَرَ بِدَفْنِهِمْ بِدِمَائِهِمْ، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ، وَلَمْ يُغَسِّلْهُمْ.))[2]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے احد کے شہداء کو ایک ہی کپڑے میں دو دو کو کفن دیا اور آپ ﷺ دریافت فرماتے کہ ان میں قرآن کا عالم سب سے زیادہ کون ہے؟ جب کسی ایک کی طرف اشارہ کر کے آپ کو بتایا جاتا تو لحد میں آپ ﷺ انہی کو آگے فرماتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میں ان سب پر گواہ رہوں گا۔ پھر آپ ﷺ نے تمام شہداء کو خون سمیت دفن کرنے کا حکم فرما دیا اور ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی اور نہ انہیں غسل دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کو بلا غسل ان کے اپنے لباس میں صلوٰۃ الجنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا۔

جبکہ اس بحث میں صلوٰۃ الجنازہ کے قائل حضرات اپنے موقف پر دوسری یعنی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضور ﷺ کا عمل صلوٰۃ الجنازہ پڑھنے کا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

((أُتِيَ بِهِمْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ أُحُدٍ، فَجَعَلَ يُصَلِّي عَلَى عَشَرَةٍ عَشَرَةٍ، وَحَمْزَةُ هُوَ كَمَا هُوَ، يُرْفَعُونَ وَهُوَ كَمَا هُوَ مَوْضُوعٌ))[3]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۱۹۰

۲۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلاة على الشهيد، حدیث: ۱۲۷۸، ص: ۱/۴۵۰

۳۔ ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب الصلاة على الشهيد، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان) حدیث: ۱۵۱۳، حدیث صحیح

ترجمہ: "غزوۂ احد کے دن شہداء رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے گئے، تو آپ دس دس آدمیوں پر نماز جنازہ پڑھنے لگے، اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش اسی طرح رکھی رہی اور باقی لاشیں نماز جنازہ کے بعد لوگ اٹھا کر لے جاتے رہے، لیکن حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش جیسی تھی ویسی ہی رکھی رہی۔"

امام مالک و امام شافعی فرماتے ہیں کہ ان سب روایتوں میں کلام ہے اور سب کی سند مجروح ہے۔ صرف عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح ہے مگر یہ غزوۂ احد کے آٹھ برس بعد کا واقعہ ہے کہ "وفات کے قریب حضور ﷺ نے شہداء پر وداع کے طور پر دعاء پڑھی تھی، جس طرح جنت البقیع میں جاکر آپ ﷺ موتیٰ کے لیے دعائیں پڑھتے تھے۔"[1]

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

((صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وسلم على قتلى أحد بعد ثماني سنين، كالمودع للأحياء والأموات، ثم طلع إلى المنبر فقال) إني بين أيديكم فرط،وإني عليكم لشهيد، وإن موعدكم حوض،وإني لأنظر إليه من مقامي هذا،وإني لست أخشى عليكم أن تشركوا،ولكني أخشى عليكم الدنيا وتنافسوها))[2]

ترجمہ: "حضور ﷺ نے آٹھ برس کے بعد احد کے شہیدوں پر اس طرح نماز پڑھی جیسے کوئی زندوں اور مردوں کو رخصت کرتا ہے پھر واپس آکر منبر پر تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا کہ میں تمہارا پیش خیمہ ہوں تمہارے اعمال کا گواہ ہوں اور میری اور تمہاری ملاقات حوض کوثر پر ہوگی اور میں تو اسی جگہ سے حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں مجھے اس کا ڈر بالکل نہیں ہے کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے البتہ میں اس بات کا اندیشہ کرتا ہوں کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے دنیا کے مزوں میں پڑ کر رشک و حسد نہ کرنے لگو۔"

اس مسئلہ کے بارے میں علامہ ٹھٹھوی صاحب نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔[3]

"احناف کہتے ہیں کہ ان کی روایات کی سندیں درجہ حسن سے نازل نہیں ہیں اور استدلال کے لیے حدیث کا کم از

۱۔ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، حدیث:۱۵۱۳

۲۔ بخاری، صحیح بخاری، كتاب المغازي، باب غزوة أحد، حدیث:۳۸۱۶، ص:۱۴۸۶/۴

۳۔ نبی کریم ﷺ نے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔ پھر شہداء کی نماز اس طرح پڑھی کہ ہر شہید کے جنازہ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رکھتے اور اس کی نماز ادا کرتے۔ اسی طرح حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ ستر بار پڑھی گئی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر شہید کی نماز ادا فرمائی اور ہر جنازہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں رکھا جاتا پھر نماز ادا کی جاتی۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی حقیقتاً آپ ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ ستر بار نہیں پڑھی۔ علمائے احناف نے اسی روایت کو بنیاد بنا کر فرمایا کہ شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ ایک قول کے مطابق حضرت مآب ﷺ نے شہدائے احد کی نماز جنازہ ادا نہ فرمائی۔ اس روایت کی بنا پر شافعی علماء کا کہنا ہے کہ شہداء کی نماز جنازہ ادا نہ کی جائے۔ ٹھٹھوی، بذل القوۃ، ص:۳۳۱۔۳۳۲

کم حسن ہونا ضروری ہے۔ خصوصاً جب متعدد طریقے سے تضاد موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ مثبت ہیں اور اس کے خلاف صرف ایک حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اور وہ بھی نافی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ "مثبت کو نافی پر تقدم ہوتا ہے۔"[۱] اور اس کی مزید تشریح حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔[۲]

صاحب اصح السیر نے اپنی کتاب میں فقہاء کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کی مکمل تفصیل شرح سفر السعادۃ میں ذکر کی ہے لہذا اس تفصیل کو حاشیہ میں ذکر کیا ہے۔[۳]

اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ انہوں نے جو اصول بیان کیے ہیں کہ دلیل کے لیے حدیث کا کم از کم حسن ہونا ضروری ہے اور اس لیے کہ مانعین نے جو روایات ذکر کی ہیں وہ نافی ہیں اور قاعدہ ہے کہ مثبت کو نافی پر تقدم ہوتا ہے لہذا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس مسئلہ میں زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے اور صاحب اصح السیر نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

۴۔ شہداء کی تدفین:

سنت یہ ہے کہ شہید کو اس کے مقتل میں ہی دفن کیا جائے اور دوسری جگہ نہ لے جایا جائے۔ غزوۂ احد میں بھی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے شہداء کو مدینہ لے گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان ہوا کہ شہداء کو ان کے مقتل میں لے جاؤ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سنا تو واپس ہوئے اور شہداء کو ان کے مقتل میں دفن کیا۔ جس کی وضاحت درج ذیل حدیث میں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے قتال کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، میرے والد عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم اہل مدینہ کے ساتھ رہو اور اس جنگ کے انجام کو دیکھو۔ اللہ کی قسم! اگر میں اپنے بعد اپنی بیٹیوں کو نہ چھوڑ کر جا رہا ہوتا تو میں یہ پسند کرتا کہ تم میری

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۲

۲۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنے والد اور ماموں کی لاشوں کو لے کر مدینہ چلے گئے تھے تاکہ اپنے قبرستان میں ان کو دفن کریں۔ غالباً نماز کے وقت وہ موجود نہ تھے۔ اس لیے ان کو حال معلوم نہ ہوا، لیکن جو لوگ موجود تھے اور بیان کرتے ہیں کہ نماز ہوئی ان کے بیان سے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ (اصح السیر، ص:۱۹۲)

۳۔ شرح سفر السعادۃ میں نماز جنازہ کے مسئلہ بارے میں فقہاء کرام کے اختلاف کو ذکر کیا گیا ہے، اس مسئلہ میں امام شافعی امام مالک، امام احمد اور امام ابو حنیفہ کا اختلاف ہے۔ "امام شافعی اور امام مالک شہید پر نماز جنازہ نہیں پڑھتے ہیں۔ امام احمد سے دو قول مروی ہیں اور ان کے ان دو مذاہب اور اقوال میں سے مشہور اور مختار قول عدم نماز جنازہ کا ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ شہید کی نماز جنازہ پڑھنا واجب ہے۔ امام صاحب کی دلیل حدیث حنظلہ بن ابی عامر والی ہے۔ امام احمد کا دوسرا قول بھی یہی ہے۔" (شیخ مجد دی شیرازی، شرح سفر السفادہ (کتب خانہ مجلس شوری اسلامی، جمہوری اسلامی ایران) ص:۱۹۷، ۱۹۶)

نظروں کے سامنے شہید ہو جاؤ۔ اب میں مدینہ منورہ میں جنگ کے نتیجہ کے انتظار میں رہا تھا کہ میری پھوپھی میرے والد اور ماموں عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کو اونٹ پر رکھے ہوئے آگئیں، میں انہیں لے کر مدینہ منورہ لے گیا تاکہ ان کو اپنے آبائی قبرستان میں دفن کروں، اتنے میں ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ:

((أَلَاإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَرْجِعُوا بِالْقَتْلَى،فَتَدْفِنُوهَا فِي مَصَارِعِهَا حَيْثُ قُتِلَتْ،فَرَجَعْنَا بِهِمَا فَدَفَنَّاهُمَا حَيْثُ قُتِلَا فَبَيْنَمَا أَنَا فِي خِلَافَةِ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ إِذْ جَاءَنِي رَجُلٌ فَقَالَ:يَا جَابِرُ بْنَ عَبْدِ اللهِ،وَاللهِ لَقَدْ أَثَارَ أَبَاكَ عُمَّالُ مُعَاوِيَةَ،فَبَدَا فَخَرَجَ طَائِفَةٌ مِنْهُ، فَأَتَيْتُهُ فَوَجَدْتُهُ عَلَى النَّحْوِ الَّذِي دَفَنْتُهُ،لَمْ يَتَغَيَّرْ إِلَّا مَا لَمْ يَدَعِ الْقَتْلُ أَوِ الْقَتِيلُ فَوَارَيْتُهُ))(۱)

ترجمہ: "خبر دار! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم شہداء کو واپس احد لے جا کر ان کے شہید ہونے کے مقامات پر ہی دفن کرو۔ چنانچہ ہم نے ان کو واپس لے جا کر ان کے مقام شہادت پر دفن کیا سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت تھا کہ ایک آدمی نے آکر مجھ سے کہا: اے جابر بن عبداللہ! سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے اہلکاروں نے تمہارے باپ کی قبر کو کھول ڈالا ہے اور ان کی میت ظاہر ہوگئی ہے اور اس کا کچھ حصہ قبر سے باہر نکل آیا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ میں نے ان کو جس حال میں دفن کیا تھا، وہ اسی طرح تھے، ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، البتہ قتل والے زخم بدلے ہوئے تھے، چنانچہ میں نے ان کو دوبارہ دفن کر دیا"۔

اس حدیث کے تحت صاحبِ اصح السیر لکھتے ہیں کہ شہید کو اس کے مقتل میں ہی دفن کرنا چاہیے۔اس حکم کی حکمت ظاہر کرنے کے لیے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول بھی نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد اور ماموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے احد کی جنگ کے بعد وہیں ان کے مقتل میں دفن کیا۔ لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں انہیں خبر ہوئی کہ ان کے والد کی قبر کھل گئی ہے۔ انہوں نے جا کر دیکھا تو جس طرح ان کو دفن کیا تھا بلکل اسی طرح تھے کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد سے قاعدہ ہو گیا کہ شہید کو اس کے مقتل میں ہی دفن کیا جائے۔(۲)

نمازِ جنازہ کے مسئلہ میں بھی مصنف نے تفصیلاً بحث کی ہے اور احادیث کی قوت کی بناء پر سب کچھ واضح ہونے کے بعد قائلین کو راجح قرار دیا ہے۔ اور مزید یہ کہ اپنے اس موقف کی تائید میں دلیل کے طور پر واقعاتِ غزوۂ احد سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء کی نماز جنازہ پڑھی اور سنت یہ ہے کہ شہداء کو ان کے مقتل میں دفن

۱۔ احمد بن عبد الرحمن بن محمد، مسند احمد، الطبعہ الثانیہ، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان) حدیث:۱۱۸۲۳، ص:۲۲/۳۰۹، حدیث صحیح

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۳

کیاجائے اور دوسری جگہ ان کو نہ لے جایاجائے۔"[1]

تدفین کے مسئلہ میں دونوں فریقین کے دلائل کی اچھی طرح تحقیق و توضیح کے بعد اس بات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قائلین کے دلائل مانعین کی نسبت مضبوط ہیں اور یہ اصول بھی قائلین کے مذہب کی تائید کرتا ہے کہ " مثبت کو نافی پر تقدم ہوتا ہے" اس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ شہداء کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیے اوران کو ان کے مقتل میں ہی دفن کیا جائے۔

خلاصہ بحث:

اس فصل میں غزوۂ احد کے تحت شہداء کی تجہیز و تکفین کے متعلق چار مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں شہداء کو غسل دینا، کفن دینا، شہداء کی نماز جنازہ اور شہداء کی تدفین کے متعلق مسائل ہیں۔ اور ہر مسئلہ کو آسان فہم انداز میں بیان کرتے ہوئے حسب ضرورت دلیل کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری کے لئے ان مسائل کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۳

فصل دوم

زکوٰۃ اور غنائم کے و مسائل

ا۔زکوٰۃ کی اہمیت:

زکوۃ ہر مسلمان عاقل بالغ پر جو مقررہ نصاب کا مالک ہو فرض ہے۔اس پر اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ نماز،روزہ کی طرح زکوۃ بھی فرض ہے۔زکوۃ کے لغوی معنیٰ نمو کے ہیں اور زکوۃ کو زکوۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے ادا کرنے سے مال کا تحفظ اور نمو ہوتا ہے۔اس سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے اور آخرت میں جو اس کا بدلہ ہو گا وہ اس کے علاوہ ہے۔قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اکثر جگہ زکوۃ کی تاکید نماز کے ساتھ ساتھ آئی ہے۔

➢ فرضیت زکوٰۃ:

تفسیر روح المعانی میں ہے:

"إن الزكاة فرضت بمكة من غير تعيين للأنصباء و الذي فرض بالمدينة تعيين الأنصباء."(۱)

ترجمہ:زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہوا،البتہ نصاب اور مقدارِ زکوٰۃ کا بیان ہجرت کے بعد سن ۲ھ کو مدینہ طیبہ میں ہوا،اور زکوۃ کی وصول یابی کا نظام فتح مکہ کے بعد سن ۸ھ کو عمل میں آیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾(۲)

ترجمہ:اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا تو فرمایا کہ:

((ادْعُهُمْ إِلَى:شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ،فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذَلِكَ،فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ،فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذَلِكَ، فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ))(۳)

ترجمہ:تم انہیں اس کلمہ کی گواہی کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا

۱۔ آلوسی، محمود، علامہ، روح المعانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، سورۃ المزمل، رقم الآیۃ:۲۰، ص:۱۵/۱۲۶

۲۔ البقرۃ:۲/۴۳

۳۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ ،باب وجوب الزکاۃ، حدیث:۱۳۳۱، ص:۲/۵۰۵

رسول ہوں۔ اگر وہ لوگ یہ بات مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ لوگ یہ بات بھی مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر کچھ صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لے کر انہیں کے محتاجوں میں لوٹا دیا جائے گا۔

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ بھی نماز کی طرح ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے۔

۲۔ قابلِ زکوٰۃ اموال:

صاحب اصح السیر قابلِ زکوۃ اموال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"زکوۃ چار قسم کے اموال پر ہے اور فی الواقع مالیت کے اعتبار سے ان چار قسم میں ہر طرح کے اموال آجاتے ہیں۔

اوّل: زراعت کے غلہ اور درختوں کے ثمار۔

دوم: مویشی یعنی جانور: اونٹ، گائے، بھینس، بکری، بھیڑ۔

سوم: وہ دونوں جواہرات بالذات جن پر انتظام عالم کا مدار ہو گیا ہے یعنی سونا، چاندی۔

چہارم: اموال تجارت بہ جمیع اقسامہ۔"(۱)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ ان اموال پر ہے جن سے انسان نفع حاصل کرتا ہے۔ اور وہ انسان کے استعمال کی چیزوں کے علاوہ ہوں۔

۳۔ وقتِ زکوٰۃ:

وقت زکوٰۃ کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

"زکوۃ سال میں صرف ایک دفعہ فرض ہے، اور اس میں مالدار اور فقیر دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اگر سال سے کم میں فرض یا سال میں دو دفعہ فرض ہوتی تو اغنیاء کے لیے مضر تھا، اور سال سے زیادہ مدت میں زکوۃ فرض ہوتی یا عمر میں ایک ہی دفعہ فرض ہوتی تو یہ فقراء و مساکین کے لیے مضر تھا کیونکہ ان کو ہر پیداوار سے مناسب انتفاع نہ ملتا۔"(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ نے اعتدال رکھا ہے، نہ تو وہ اتنی زیادہ ہے کہ اغنیاء پر بوجھ ہو اور نہ اتنی کم ہے کہ اس سے غریبوں کے حق کا استحصال ہو۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۶

۲۔ ایضاً، ص:۴۱۶

۴۔ مقدارِ زکوٰۃ:

مقدار زکوٰۃ کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

"مقدار زکوۃ مختلف چیزوں کی مختلف ہے، اور اس میں اس امر کی رعایت رکھی گئی ہے کہ جس مال کی تحصیل میں مشقّت کم ہے اس میں زکوۃ زیادہ ہے، اور جس میں مشقّت زیادہ ہے اس میں زکوۃ کی مقدار کم ہے۔"[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو انسانی مشقت کے اعتبار سے فرض کیا ہے۔ یعنی کہ جس مال کے حصول میں انسانی مشقت اور تکلیف جتنی کم ہو اس پر اتنی ہی زکوٰۃ زیادہ ہوتی ہے۔ اور جس مال کے حصول میں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے اس پر زکوٰۃ بھی کم ہے۔

۵۔ رکاز:

رکاز یعنی وہ مال جو زمین کے اندر جمع ہو، اس کی دو قسمیں ہیں۔ معدن: یعنی وہ خزانہ جو زمین کے اندر پیدا ہوا ہو۔ اور کنز: وہ مال جس کو کسی شخص نے زمین کے اندر دفن کر رکھا ہو۔

رکاز کی زکوۃ کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

"کسی شخص کو اگر کسی چیز کا خزانہ مدفون یا معدن ملا ہو تو اس پر زکوۃ کی سب سے بڑی قسم یعنی خمس واجب ہو گا کیونکہ رب المال کو اس کے حصول میں کوئی دقت اور تکلیف پیش نہیں آتی۔"[۲]

اس کی مزید تفصیل صاحب ہدایہ نے بیان کی ہے جس کو حاشیہ میں ذکر کیا گیا ہے۔[۳]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رکاز پر سب سے زیادہ زکوٰۃ اس لیے رکھی ہے کہ اس میں مشقت سب

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۷

۲۔ ایضاً، ص:۴۱۷

۳۔ اس دفینہ کی تین صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ اس پر علامت اسلام ہو یعنی کلمہ شہادت وغیرہ لکھا ہوا ہو گا تو اس کا حکم لقطہ کا ہو جائے گا اور جس کی زمین سے نکلا ہے وہ اس کے لئے اعلان کرے گا کچھ عرصے تک اعلان کرنے کے بعد اگر اس کا مالک نہ ملا تو پھر وہ اگر خود غریب ہے تو اپنے اوپر صدقہ کرلے گا اگر غریب نہیں ہے تو وہ اس کو غرباء میں تقسیم کر دے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر علامت کفر ہو اگر اس پر علامت کفر ہو گی تو یہ مال غنیمت شمار ہو گا اور جس کی زمین سے نکلا ہو گا وہ اس کا حقیقی مالک ہو گا اور حکماً اس پر مجاہدین کا قبضہ ہو گا اس لیے چار خمس اس کا ہو گا جس کی زمین سے نکلا ہے اور پانچواں خمس مجاہدین میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ دفینہ مشتبہ ہو یعنی اس پر نہ کوئی علامت اسلام ہو اور نہ علامت کفر ہو تو ظاہر مذہب یہ ہے کہ اس کو جاہلی اور کفری قرار دیا جائے گا کیونکہ اس کا کفری ہونا ہی اصل ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اسکو اسلامی قرار دیا جائے گا کیونکہ اسلام بہت قدیم ہو چکا ہے اس لیے ظاہر یہی ہے کہ یہ کفار کے ہاتھوں کو دفن کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اہل اسلام کا دفن کردہ ہے۔ (سکروڈھوی، مولانا جمیل احمد، اشرف الہدایہ (دارالاشاعت، اردو بازار ایم اے جناح روڈ، کراچی، پاکستان)، کتاب الزکوۃ: ۳/۱۰۳-۱۰۵)

سے کم درجے کی ہے۔

۶۔ نصابِ زکوٰۃ:

نصابِ زکوٰۃ کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

"ہر چیز کے لیے ایک مقدار حضور ﷺ نے معین کر دی ہے کہ کسی کے پاس وہ مال اس مقدار سے کم ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اس مقدار کو نصابِ زکوۃ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ اسی شخص پر واجب ہے جو نصاب کا مالک ہو۔"[۱]

۷۔ زراعت:

صاحب اصح السیر زراعت کو دو قسموں کی صورت میں بیان فرماتے ہیں۔ پہلی قسم یعنی وہ زراعت جو بارش اور نہر کے پانی سے پیدا ہو اور دوسری وہ جو کنواں یا تالاب کے پانی سے پیدا ہو۔

زراعت کی پہلی قسم کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

" جو بارش یا نہر کے پانی سے پیدا ہوا اس کے بونے اور کاٹنے میں رکاز سے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے اس لئے اس پر عشر[۲] واجب ہے یعنی اس کی زکوۃ رکاز سے نصف ہے۔"[۳]

زراعت کی دوسری قسم کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

"اور جو چاہ یعنی کنواں یا تالاب کے پانی سے پٹائی جائے، اس میں آدمی کی قوت صرف ہوتی ہے اور پہلی قسم کے زراعت سے بہت زیادہ محنت لیتی ہے اس لئے جوتنا، بونا، پانی پٹانا وغیرہ سخت محنت کا کام ہے اس لیے اس کی زکوۃ نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہے۔"[۴]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۸

۲۔ زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہونے کے سلسلہ میں فقہاء احناف کا اختلاف ہے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مطلقاً زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے پیداوار کم ہو یا زیادہ بغیر تدبیر اختیار کیے ایک سال تک باقی رہنے والی ہو یا باقی رہنے والی نہ ہو زمین کو نہر وغیرہ کے جاری پانی سے سیر اب کیا ہو یا بارش کے پانی سے سیر اب کیا بہر صورت عشر واجب ہو گا۔ صاحبین نے فرماتے ہیں کہ زمین کی پیداوار میں دو شرطوں کے ساتھ عشر واجب ہو گا ایک یہ کہ وہ چیز زمین سے پیدا کی گئی ہے بغیر کسی علاج کے ایک سال تک باقی رہ سکتی ہے جیسے گندم چاول وغیرہ اس میں عشر واجب ہو گا۔ اور دوسری وہ جو ایک سال تک باقی نہ رہ سکتی ہو اس میں عشر واجب نہ ہو گا جیسے انگور خربوزہ تربوز سے وغیرہ اور یہ کہ پیداوار پانچ وسق کی مقدار ہو اس سے کم میں عشر واجب نہ ہو گا۔ مزید تفصیل کے لیے اشرف الہدایہ ملاحظہ فرمائیں۔ (سکروڈھوی، مولانا جمیل احمد، اشرف الہدایہ (دارالاشاعت، اردو بازار ایم اے جناح روڈ، کراچی، پاکستان)، کتاب الزکوۃ:۳/۱۰۹)

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۷

۴۔ ایضاً

اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس فصل کے بونے اور کاٹنے میں خرچہ اور مشقت کم ہو اس میں عشر ہے اور جس فصل کے بونے اور کاٹنے میں خرچہ اور مشقت زیادہ ہو اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہے۔

۸۔اموال تجارت:

اموال تجارت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں؛

((فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ))[۱]

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ ہم کو حکم دیتے تھے کہ ہم ان چیزوں میں سے زکوۃ نکالیں جنہیں ہم بیچنے کے لیے رکھتے تھے۔"

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو سامان بھی تجارت کی غرض سے ہم لیتے ہیں یا بیچتے ہیں اس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے اور یہ وہ سامان ہوتا ہے جو ذاتی استعمال کے علاوہ ہوتا ہے۔

اسی طرح صاحب اصح السیر اموال تجارت کی زکوۃ کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

"تجارت کے لئے سفر کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور نفع بھی بنسبت زراعت کے بہت کم ہوتا ہے اس لیے اس کی زکوۃ ربع عشر ہے یعنی چالیسواں حصہ اور یہ زکوۃ کی سب سے کم مقدار ہے"[۲]

۹۔سونا اور چاندی میں زکوۃ:

سونا کے نصاب کے متعلق صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ:

"سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور فضا یعنی چاندی کا دو سو درہم اور جو چیز چاندی یا سونے سے بنی ہوئی ہو اس میں اسی کے نصاب کا وزن معتبر ہو گا اور سونا یا چاندی کے ساتھ دوسری چیز ملی ہو تو اس کی قیمت کا اعتبار ہو گا، یعنی دونوں میں سے کسی ایک انصاف کی قیمت کا مال ہو تو اس پر زکات واجب ہو جائے گی ، چاندی اور سونا دو نصاب سے کم ہو لیکن دونوں کی قیمت ملا کر کسی ایک انسان کا نصاب ہو جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔"[۳]

۱۔ آبو داود، سلیمان بن الأشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، (المکتبہ العصریہ، بیروت)، کتاب الزکوۃ، باب تجارتی سامان میں زکوۃ، حدیث:۱۵۶۲

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۱۷

۳۔ ایضاً، ص:۴۱۸

۱۰۔ زکوٰۃ مویشی:

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ان کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بحران بھیجا تو زکوۃ کے متعلق ایک تحریر ان کو لکھ کر دی اس کا مضمون یہ تھا۔

((بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ هَذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ وَالَّتِي أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولَهُ ، فَمَنْ سُئِلَهَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ عَلَى وَجْهِهَا فَلْيُعْطِهَا ، وَمَنْ سُئِلَ فَوْقَهَا فَلَا يُعْطِ فِي أَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ مِنَ الْإِبِلِ فَمَا دُونَهَا مِنَ الْغَنَمِ مِنْ كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ إِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وَعِشْرِينَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلَاثِينَ فَفِيهَا بِنْتُ مَخَاضٍ أُنْثَى فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَثَلَاثِينَ إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِينَ فَفِيهَا بِنْتُ لَبُونٍ أُنْثَى، فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَأَرْبَعِينَ إِلَى سِتِّينَ فَفِيهَا حِقَّةٌ طَرُوقَةُ الْجَمَلِ ، فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَسِتِّينَ إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِينَ فَفِيهَا جَذَعَةٌ ، فَإِذَا بَلَغَتْ يَعْنِي سِتًّا وَسَبْعِينَ إِلَى تِسْعِينَ فَفِيهَا بِنْتَا لَبُونٍ ، فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدَى وَتِسْعِينَ إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ فَفِيهَا حِقَّتَانِ طَرُوقَتَا الْجَمَلِ ، فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ فَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ وَفِي كُلِّ خَمْسِينَ حِقَّةٌ ، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ مَعَهُ إِلَّا أَرْبَعٌ مِنَ الْإِبِلِ فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا مِنَ الْإِبِلِ فَفِيهَا شَاةٌ وَفِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ فِي سَائِمَتِهَا إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِينَ إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ شَاةٌ ، فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ إِلَى مِائَتَيْنِ شَاتَانِ ، فَإِذَا زَادَتْ عَلَى مِائَتَيْنِ إِلَى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِيهَا ثَلَاثُ شِيَاهٍ ، فَإِذَا زَادَتْ عَلَى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ ، فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً مِنْ أَرْبَعِينَ شَاةً وَاحِدَةً فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا وَفِي الرِّقَّةِ رُبْعُ الْعُشْرِ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ إِلَّا تِسْعِينَ وَمِائَةً فَلَيْسَ فِيهَا شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا.))[1]

ترجمہ: "شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ یہ زکوٰۃ کا وہ فریضہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لیے فرض قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا۔ اس لیے جو شخص مسلمانوں سے اس پروانہ کے مطابق زکوٰۃ مانگے تو مسلمانوں کو اسے دے دینا چاہیے، اور اگر کوئی اس سے زیادہ مانگے تو ہرگز نہ دے۔ چوبیس یا اس سے کم اونٹوں میں ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری دینی ہو گی۔ (پانچ سے کم میں کچھ نہیں) لیکن جب اونٹوں کی تعداد پچیس تک پہنچ جائے تو پچیس سے پینتیس تک ایک ایک برس کی اونٹنی واجب ہو گی جو مادہ ہوتی ہے۔ جب اونٹ کی تعداد چھتیس تک پہنچ جائے (تو چھتیس سے) پینتالیس تک دو برس کی مادہ واجب ہو گی۔ جب تعداد چھیالیس

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم، حدیث:۱۳۸۶، ص:۲/۵۲۷

تک پہنچ جائے (تو چھیالیس سے) ساٹھ تک میں تین برس کی اونٹنی واجب ہو گی جو جفتی کے قابل ہوتی ہے۔ جب تعداد اکسٹھ تک پہنچ جائے (تو اکسٹھ سے) پچھتر تک چار برس کی مادہ واجب ہو گی۔ جب تعداد چھہتر تک پہنچ جائے (تو چھہتر سے) نوے تک دو دو برس کی دو اونٹنیاں واجب ہوں گی۔ جب تعداد اکیانوے تک پہنچ جائے تو (اکیانوے سے) ایک سو بیس تک تین تین برس کی دو اونٹنیاں واجب ہوں گی جو جفتی کے قابل ہوں۔ پھر ایک سو بیس سے بھی تعداد آگے بڑھ جائے تو ہر چالیس پر دو برس کی اونٹنی واجب ہو گی اور ہر پچاس پر ایک تین برس کی۔ اور اگر کسی کے پاس چار اونٹ سے زیادہ نہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی مگر جب ان کا مالک اپنی خوشی سے کچھ دے۔ اور بکریوں کی زکوٰۃ جو سال کے اکثر حصے جنگل یا میدان وغیرہ میں چر کر گزارتی ہیں اگر ان کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی ہو تو چالیس سے ایک سو بیس تک ایک بکری واجب ہو گی اور جب ایک سو بیس سے تعداد بڑھ جائے (تو ایک سو اکیس سے) سے دو سو تک دو بکریاں واجب ہوں گی۔ اگر دو سو سے بھی تعداد بڑھ جائے تو (تو دو سو ایک سے) تین سو تک تین بکریاں واجب ہوں گی اور جب تین سو سے بھی تعداد آگے نکل جائے تو اب ہر ایک سو پر ایک بکری واجب ہو گی۔ اگر کسی شخص کی چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی مگر اپنی خوشی سے مالک کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ اور چاندی میں زکوٰۃ چالیسواں حصہ واجب ہو گی لیکن اگر کسی کے پاس ایک سو نوے (درہم) سے زیادہ نہیں ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی مگر خوشی سے کچھ اگر مالک دینا چاہیے تو اور بات ہے۔"

اس حدیث کے تحت تین قسم کے جانوروں پر زکوۃ دینے کا حکم حضور ﷺ سے ثابت ہے ایک اونٹ تو دوسرے گائے اور اسی قسم میں بھینس داخل ہے تیسرے غنم اس میں بکری، خصی اور بھیڑ داخل ہے۔ جن کی تفصیل اوپر حدیث میں گزر چکی ہے۔

۱۱۔ مصارفِ زکوٰۃ:

مصارف زکوۃ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾(۱)

ترجمہ: "صدقے صرف فقیروں کے لئے ہیں اور مسکینوں کے لئے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لئے اور ان کے لئے جن کے دل پر چائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے میں اور قرضداروں کے

۱۔ التوبہ:۹/۶۰

لئے اور اللہ کی راہ میں اور راہ گیر و مسافروں کے لئے فرض ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

صاحب اصح السیر مصارف زکوۃ کو کچھ اس طرح سے بیان فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کے آٹھ مصارف بتائے ہیں۔اس میں اب مؤلفۃ القلوب کا حصہ نہیں رہا اور عاملینِ صدقہ کا حق اس وقت ہے جب امام عامل کے ذریعے صدقہ کے جمع وخرچ کا انتظام کرے۔ لیکن جب صاحبِ مال خود زکوٰۃ تقسیم کرے تو عامل کا حق نہیں کیونکہ اس وقت عامل ہوتا ہی نہیں۔ اس لیے صرف چھے مصرف باقی رہ جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔(۱)فقراء (۲)مساکین یعنی محتاج (۳) غلاموں کو آزاد کرانے میں (۴)تاوان میں امداد کرنا (۵)غزوات میں (۶)مسافروں کی امداد میں۔"[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب اور عاملین زکوٰۃ کو نکال کر چھے مصرف باقی رہ جاتے ہیں۔اور چونکہ موجودہ زمانہ میں تو غلاموں کا رواج بھی نہیں رہا تو اس طرح باقی پیچھے صرف پانچ مصرف ہی رہ جاتے ہیں۔

۱. فقراء
۲. مساکین یعنی محتاج
۳. تاوان میں امداد کرنا
۴. غزوات میں
۵. مسافروں کی امداد میں

۱۲۔احکام غنائم:

غنائم کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ﴾[۲]

ترجمہ: جان لو کہ تم جس قسم کی جو کچھ غنیمت حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کا ہے۔

صاحب اصح السیر غنائم کی تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مقاتلہ اور جنگ کے بعد قہر اور غلبہ سے کفار کے جن اموال پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا ہو اس کو "غنیمت

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۲۲

۲۔ الانفال:۸/۴۱

"کہتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ خداوندِ کریم نے اس امت کے لیے غنیمت کو حلال کیا ہے۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار سے جنگ کے بعد حاصل ہونے والے مال کو مال غنیمت کہتے ہیں اور یہ صرف اس امت کے لئے حلال کیا گیا ہے۔

۱۳۔ غنائم کی تقسیم:

صاحب اصح السیر اموال کی اقسام بیان کرتے ہوئے غنیمت کے بیان میں اس کی تقسیم کے قاعدہ میں چار چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، صفی رسول اور غیر حاضرین کا سہم، تنفیل اور اسلاب کا حکم۔ اور اسی کے ذیل میں غیر منقولات کے احکام بھی بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ اول تقسیم کا قاعدہ یہ ہے کہ اموال غنیمت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ منقولہ، غیر منقولہ۔ اموالِ منقولہ کے پانچ حصے کیے جاتے تھے۔ ایک حصہ حضور ﷺ اپنے لیے رکھتے اور باقی کو غانمین میں تقسیم کیا جاتا۔

➢ غیر منقولات کا حکم:

صاحب اصح السیر غیر منقولات کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے آیتِ خمس میں اموالِ منقولہ اور غیر منقولہ میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ لیکن آپ ﷺ کا طریقہ غیر منقولہ کے بارے میں مختلف مواقع پر مختلف رہا ہے۔ مثلاً بنی نضیر کی زمینیں جو اموالِ فئی میں رسول ﷺ کو ملیں انہیں تقسیم نہیں کیا گیا جب کہ بنی قریظہ کی زمینیں جو کہ مقاتلہ کے بعد فتح ہوئیں وہ خمس نکالنے کے بعد صرف حاجت مندوں میں تقسیم کی گئیں یعنی مہاجرین کو کیونکہ وہ زیادہ ضرورت مند تھے اور ان انصار میں سے صرف تین صحابہ کرام کو۔ اسی طرح خیبر کی نصف زمین محفوظ رکھی گئی اور باقی آدھی کو خمس نکالنے کے بعد غانمین پر تقسیم کیا گیا جبکہ مکہ کی اراضی میں سے نہ خمس نکالا گیا، نہ محفوظ رکھی گئیں اور نہ تقسیم کی گئیں، بلکہ اسے اپنے حال پر جس طرح جس کے قبضے میں تھیں چھوڑ دی گئیں۔"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا غیر منقولات یعنی زمینوں کی تقسیم وغیرہ کا طریقہ مختلف غزوات میں مختلف رہا ہے لہذا اس کو کسی حتمی شکل میں بیان کرنا مناسب نہیں۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۸۵

۲۔ ایضاً، ص:۴۳۳

۱۴۔ صفی رسول:

صاحب اصح السیر صفی رسول کی بحث سے یہ خلاصہ نکالتے ہیں لکھتے ہیں کہ:

"صفی رسول ﷺ سے مراد ہر وہ چیز جو رسول ﷺ قبل از تقسیم مالِ غنیمت میں سے اپنے لیے پسند کر لیتے۔"[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفی رسول بھی اعجاز رسول میں سے ہے کہ آپ ﷺ جو چاہیں لے سکتے ہیں اور یہ آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ خاص تھا۔ اس لیے کہ مسلمان کے لیے مال غنیمت میں سے قبل از تقسیم کچھ اٹھانا حرام ہوتا ہے۔

۱۵۔ غیر حاضر کا سہم:

صاحب اصح السیر غیر حاضرین کے حصے کے متعلق بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"غیر حاضر کا کوئی سہم نہیں الّا یہ کہ اس کو امام کی طرف سے کسی خدمت پر مامور کیا گیا ہو"[۲]

۱۶۔ تنفیل:

صاحب اصح السیر تنفیل کی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"تنفیل یہ ہے کہ لڑائی کے وقت امام اعلان کر دے کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے یا جنگ میں کوئی نمایاں خدمت انجام دے اس کو اس کے حصے کے علاوہ عطاء کیا جائے گا اس کو تنفیل کہتے ہیں، اور یہ کہ تنفیل خمس میں سے ہوگی، اس لیے کہ امام کو صرف خمس ہی کے تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔"[۳]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنفیل کے لیے امام کا پہلے سے اعلان کرنا ضروری ہے اور یہ کہ وہ خمس میں سے ہوتا ہے خمس کے علاوہ مال میں سے نہیں ہوتا۔

۱۷۔ اسلاب:

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ اسلاب کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ امام پہلے سے اعلان کرے یا نہ کرے قتیل کے سلب کا مالک اس کا قاتل ہوگا۔ اس لیے کہ غزوۂ حنین میں حضور ﷺ نے حضرت ابو قتادۃ رضی اللہ عنہ کو جو سلب دیا تھا اس کا پہلے سے اعلان نہ کیا تھا۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۴۲۴

۲۔ ایضاً، ص: ۴۲۵

۳۔ ایضاً، ص: ۴۲۶

قتیل کے سلب کا مالک اس کا قاتل ہے۔ اور کہتے ہیں کہ سلب اصل مالِ غنیمت میں سے ہوتا ہے خمس میں سے نہیں، اور سلب کا خمس بھی نہیں لیا جاتا۔

لیکن امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کا اس میں اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ قتیل کے سلب کا مالک اس کا قاتل اسی وقت ہو گا جب امام اس کے لیے پہلے سے اعلان کر دے، اور وہ خمس میں سے ہو گا۔ اس لیے کہ آیت (وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ) میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ خمس کے سوا بقیہ غنیمت سب غانمین کا ہے۔[1]

صاحب اصح السیر اس اختلاف کو ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

> " سلب کا مالک اس کا قاتل اسی وقت ہو گا جب امام اس کے لیے پہلے سے اعلان کر دے، سلب کا حکم نفل کا ہے اور یہ خمس میں سے ہو گا"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلاب کے حکم میں صاحب اصح السیر کی رائے امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی تائید میں ہے کہ امام کا پہلے سے اعلان کرنا ضروری ہے اور یہ خمس میں محسوب ہو گا۔ اور فتویٰ بھی اسی پر ہے۔

۱۸۔ احکام خمس:

خمس کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾[3]

ترجمہ: جان لو کہ تم جس قسم کی جو کچھ غنیمت حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کا ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خمس کے مصارف پانچ ہیں۔

۱. رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے
۲. ذوی القربیٰ
۳. یتامیٰ
۴. مساکین
۵. مسافر

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۲۷
۲۔ ایضاً
۳۔ الانفال، ۸/۴۱

صاحب اصح السیر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اب نہیں رہا۔ لہٰذا اب ذوی القربیٰ، یتیم، مساکین اور مسافر ہی خمس کے مستحق ہیں۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اب خمس میں نہیں رہا تو اب مصارف (ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، مسافر) صرف چار ہیں۔

۱۹۔ خمس کی تقسیم:

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ خمس کی تقسیم میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زکوۃ اور خمس کے جن مصارف کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اس مال کو اس کے تمام مصارف پر برابر تقسیم کرنا ضروری ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی بلکل ضرورت نہیں ہے جس مصرف میں جتنی حاجت ہو اس میں ویسا صرف کیا جائے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زکوۃ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مثل کہتے ہیں اور خمس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مثل کہتے ہیں۔[2]

صاحب اصح السیر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"چونکہ اب ذوی القربیٰ کے یتیم، مساکین و ابن سبیل ہی خمس کے مستحق ہیں اغنیاء نہیں اس لیے خمس کا مال تین سہام میں پر تقسیم ہو گا۔ اور اس میں بنی ہاشم اور بنی المطلب کے حاجت مند مقدم ہوں گے۔"[3]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خمس کے مال کو اس کے ہر ایک مصرف پر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اس لیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس مسئلہ میں زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔

۲۰۔ احکامِ فئی:

مال فئ اس مال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو کافروں سے لڑائی کے بغیر حاصل ہو جائے چاہے انہیں جلا وطن کر کے حاصل ہو یا صلح کے ساتھ حاصل ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ حشر میں بنی نضیر کے مال کو فئی کہا ہے اور اس کی یہی وجہ بتائی ہے۔

﴿وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[4]

۱۔ مرغینانی، علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل الفرغانی، الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان) ص:۲/۵۲۳

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۳۲

۳۔ مرغینانی، الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، ص:۲/۵۲۵

۴۔ الحشر:۵۹/۶

ترجمہ: "اور ان کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ہاتھ لگایا ہے جس پر نہ تو تم نے اپنے گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ اونٹ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو جس پر چاہے غالب کر دیتا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جو مال بغیر جہاد و قتال کے حاصل ہوا ہے وہ مجاہدین و غانمین میں مالِ غنیمت کے قانون کے مطابق تقسیم نہ ہو گا، بلکہ اس میں کلی اختیار رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہو گا جس کو جتنا چاہیں عطا فرمادیں یا اپنے لئے رکھیں۔ اس کی مزید تفصیل حدیث مبارکہ میں موجود ہے۔

حضرت مالک بن اوس بن حدثان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ:

((إِنَّ اللهَ قَدْ خَصَّ رَسُولَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْفَيْءِ بِشَيْءٍ لَمْ يُعْطِهِ أَحَدًا غَيْرَهُ ثُمَّ قَرَأَ [وَمَا أَفَاءَ اللهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ] إِلَى قَوْلِهِ [قَدِيرٌ] فَكَانَتْ هَذِهِ خَالِصَةً لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... يُنْفِقُ عَلَى أَهْلِهِ نَفَقَةَ سَنَتِهِمْ مِنْ هَذَا الْمَالِ ثُمَّ يَأْخُذُ مَا بَقِيَ فَيَجْعَلُهُ مَجْعَلَ مَالِ اللهِ))[۱]

ترجمہ: "اللہ نے مالِ فئی میں جس چیز کے ساتھ اپنے رسول ﷺ کو خاص کیا تھا، وہ چیز آپ ﷺ کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی، پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اللہ نے ان میں سے اپنے رسول کو جو عطا فرمایا، یہ حضرت محمد ﷺ کے لیے خاص ہے آپ ﷺ اس مال کے ذریعہ اپنے اہل و عیال پر سال بھر خرچ کرتے تھے، اور جو باقی بچ جاتا وہ آپ ﷺ اس مد میں خرچ کرتے جہاں اللہ کا مال خرچ ہونا چاہیے"۔

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ فئی کے مصرف تمام مسلمان ہیں لہذا یہ کسی خاص شخصیت کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کا فئی کے اموال میں طرز عمل یہ تھا کہ اس پر اپنا قبضہ رکھتے، لیکن اسی مال سے فقراء و مساکین کی خبر گیری کرتے۔ اس طرزِ عمل سے یہ بات مشتبہ رہی کہ فئی کا مال رسول اللہ ﷺ کی خاص ملکیت تھی یا آپ ﷺ کو بحثیت امام اس میں صرف تصرف کا حق حاصل تھا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھتے تھے کہ فئی کے اموال خاص رسول ﷺ کی ملک تھے۔ اور یہ کہ اس میں وراثت جاری ہونی چاہیے۔ مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ مال تمام مسلمانوں کا تھا۔ حضور ﷺ چونکہ سب کے ولی اور سب کے آقا ہیں اس لیے ہر طرح کے تصرف کا آپ ﷺ کو اختیار تھا لیکن یہ نبی کہ وراثت نہیں ہو سکتی۔[۲]

صاحب اصح السیر اس بحث اور اشتباہ کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

۱۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الخمس، باب فرض الخمس، حدیث: ۲۹۲۷

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۴۳۷

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ورثہ نہیں چھوڑتے وہ جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے، نہ کہ صدقہ بعد ملک، کیونکہ صدقہ کل مال میں بعد وفات نہیں ہو سکتا، وہ وصیّت ہو سکتا ہے اور وصیّت صرف ایک ثلث میں صحیح، نہ کہ کل مال میں، اس کا مطلب ہے جو مال انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے وہ پہلے ہی مملوکۂ خداوندی ہے، انبیاء علیہم السلام کو اس میں تصرف کا اختیار خدا کی طرف سے ہوتا ہے بہ طور مامور کے، نہ بے طور مالک کے اور اسی لیے انبیاء کے بعد بھی وہ صدقہ اور مملوکۂ خداوندی ہی رہتا ہے۔"(۱)

مال فئی کا مسئلہ اشکال سے پر ہے، ہمیشہ ائمہ کرام کا اس میں اختلاف رہا ہے۔ باقی جو کچھ تامّل کے بعد معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ کو مالِ فئی پر مالکانہ تصرفات کے اختیارات بطورِ خود نہیں تھے بلکہ بِاَمر اللہ حاصل تھے۔ اور ان تصرفات میں آپ ﷺ مامور من اللہ تھے۔

۲۱۔ احکامِ جزیہ:

جزیہ اس مال کو کہتے ہیں جو مقہور کفار سے ان کے نفوس کے بدلہ وصول کیا جائے۔ جب جہاد کا حکم ہوا تو اس وقت صرف دو صورت تھی یا تو کفار اسلام قبول کر لیں یا مقابلہ کریں، تیسری صورت کوئی نہ تھی ان کے لیے کہ وہ اپنی جگہ رہ سکیں، یہاں تک کہ جب خیبر فتح ہوا تو خیبر میں مقہور ہو جانے والوں کو اپنی جگہ رہنے کی اجازت دی گئی، اور ان سے بٹائی کا معاملہ طے پایا گیا۔

حضرت اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ضَرَبَ الْجِزْيَةَ عَلَى أَهْلِ الذَّهَبِ أَرْبَعَةَ دَنَانِيرَ وَعَلَى أَهْلِ الْوَرِقِ أَرْبَعِينَ دِرْهَمًا مَعَ ذَلِكَ أَرْزَاقُ الْمُسْلِمِينَ وَضِيَافَةُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ))(۲)

ترجمہ: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سونے والوں پر چار دینار اور چاندی والوں پر چالیس درہم جزیہ مقرر فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ضروریات زندگی اور تین دن کی ضیافت۔

اس حدیث مبارکہ میں ذمیوں پر جزیہ مقرر کرنے کی تصریح پائی گئی ہے۔

فقہی مسئلہ یہ ہے کہ کیا بت پرستوں سے جزیہ لے کر بت پرستی کی اجازت دینا اور قتال ترک کرنا جائز ہے کہ نہیں؟ یہاں بت پرستی صرف اس لیے کہا ہے کہ نصرانی، یہودی اور مجوسیوں سے حضور ﷺ کی روایات تو موجود ہیں، لیکن کسی بت پرست سے جزیہ لینا ثابت نہیں ہے۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۳۸، ۴۳۷

۲۔ مالک بن انس، موطاالامام مالک، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۰۶ھ)، كِتَابُ الزَّكَاةِ، بَابُ جِزْيَةِ أَهْلِ الْكِتَابِ ...، حدیث:۴۳

صاحب اصح السیر فیؒ کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"حضور ﷺ نے خود بت پرستوں کا جزیہ قبول نہ کیا اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جزیہ کا حکم جب نازل ہوا اس سے پہلے تقریباً تمام بت پرست قبائل میں اسلام پھیل چکا تھا۔ اور اس کے بعد بت پرست قبائل سے جنگ کی نوبت نہ آئی۔ اہلِ کتاب سے اس کے بعد مقابلہ ہوا اور انہیں جزیہ مقرر کیا گیا۔"[۱]

آیت جزیہ سے پہلے جن قبائل سے جنگ ہوئی ان سے جزیہ نہ لیا گیا اور نہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔ چاہے وہ بت پرست ہوں یا اہلِ کتاب۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع سب اہلِ کتاب تھے۔ مگر ان میں سے کسی کا جزیہ حضور ﷺ نے قبول نہیں فرمایا۔ کیونکہ جس وقت ان سے جنگ ہوئی تھی اس وقت تک جزیہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا، اور بت پرستوں کا معاملہ بھی اسی طرح تھا۔

اس لیے ائمہ کرام میں اختلاف ہو گیا کہ آیا بت پرستوں سے جزیہ لے کر انہیں بت پرستی کی اجازت دینا اور ان سے قتال ترک کرنا جائز ہے کہ نہیں۔ امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب اور بت پرست سب کا جزیہ قبول کرنا جائز ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صرف اہلِ کتاب سے ہی جزیہ قبول کرنا جائز ہے، اس لیے کہ کتاب اللہ میں اہلِ کتاب ہی کی قید ہے اور حضور ﷺ نے بھی صرف اہلِ کتاب ہی سے لیا۔[۲]

صاحب اصح السیر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

"اہلِ کتاب اور بت پرست کا جزیہ قبول کرنا جائز ہے، مگر خاص اہلِ عرب کے بت پرستوں کا نہیں۔ اس لیے کہ اول: وہاں حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا اس لیے وہاں بت پرستی ہرگز نہیں رہنی چاہیے۔ دوم: وہ تمام قبائل مسلمان ہو چکے تھے پھر بت پرستی اگر ہو سکتی ہے تو صرف ارتداد سے ہی ہو سکتی ہے اور مرتد بالاتفاق جزیہ سے نہیں بچ سکتا۔ سوم: حضور ﷺ کی وصیت ہے کہ جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لیے جزیہ لے کر وہاں بت پرستی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"[۳]

اس مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستوں سے جزیہ قبول کرنا ہی جائز نہیں۔ تاکہ (خاص طور پر) اہلِ عرب میں اور باقی دنیا میں بھی بت پرستی کا سرے سے ہی خاتمہ ہو جائے یا کم از کم اسلام اور بت پرستی کہیں جمع نہ ہوں۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۴۴۱، ۴۴۰

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

خلاصہ بحث:

اس فصل میں اکیس مسائل بیان کئے گئے ہیں، جن میں احکام زکوۃ، احکام غنائم، احکام جزیہ، احکام خمس اور احکام فئی کے متعلق مسائل ہیں۔ ان مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں آسان فہم انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جن مسائل میں فقہاء کا اختلاف ہے ان میں حسب ضرورت دلیل کو بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ قاری کو ان مسائل کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

فصل سوم

متفرق مسائل

یوم الرجیع، واقعہ بئر معونہ:

پانچ ہجری صفر کے مہینے میں سریۂ عبد اللہ بن انیس کے بعد یوم الرجیع اور بئر معونہ کا واقعہ پیش آیا۔ ان واقعات کے تحت صاحب اصح السیر نے جن چند ایک مسائل کو بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ان مندرجہ ذیل فقہی مسائل کو ذکر کیا جارہا ہے۔

ا۔ قنوتِ نازلہ:

قنوت دعا کو کہتے ہیں اور نازلہ کے معنی مصیبت کے ہیں، جب مسلمانوں پر کوئی عام مصیبت آجائے۔ یعنی اگر کفار کی طرف سے مسلمانوں پر عمومی طور پر ظلم وستم ہونے لگے، تو ایسے مواقع پر قنوت نازلہ کا پڑھنا صحیح اور معتبر روایات سے ثابت ہے۔ حضور ﷺ نے قنوت نازلہ میں ظالموں کے نام لے کر بددعا فرمائی اور مظلوموں کے نام لے کر دعا فرمائی

جیسے بئر معونہ کا واقعہ جس میں چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دین کی دعوت و تبلیغ کے لیے مجد روانہ کیا گیا، لیکن دھوکہ کے ساتھ راستے میں ہی بئر معونہ کے مقام پر انہیں شہید کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک مہینے تک رسول اللہ ﷺ ان مشرکین پر صبح کی نماز میں رکوع کے بعد دعا کی اسے ہی قنوت نازلہ کہتے ہیں۔[۱]

مندرجہ ذیل روایت میں ہے: حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے دعائے قنوت کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ:

((قَدْ كَانَ الْقُنُوتُ ، قُلْتُ : قَبْلَ الرُّكُوعِ أَوْ بَعْدَهُ ؟ ، قَالَ : قَبْلَهُ ، قَالَ : فَإِنَّ فُلَانًا أَخْبَرَنِي عَنْكَ أَنَّكَ قُلْتَ بَعْدَ الرُّكُوعِ ، فَقَالَ : كَذَبَ، إِنَّمَاقَنَتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوعِ شَهْرًا أُرَاهُ ، كَانَ بَعَثَ قَوْمًا يُقَالُ لَهُمْ : الْقُرَّاءُ زُهَاءَ سَبْعِينَ رَجُلًا إِلَى قَوْمٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ دُونَ أُولَئِكَ ، وَكَانَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهْدٌ ، فَقَنَتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا يَدْعُو عَلَيْهِمْ.))[۲]

ترجمہ: دعائے قنوت (نبی کریم ﷺ کے دور میں) پڑھی جاتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ رکوع سے پہلے یا اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا کہ رکوع سے پہلے۔ عاصم نے کہا کہ آپ ہی کے حوالے سے فلاں شخص

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۲

۲۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الوتر، بَابُ الْقُنُوتِ قَبْلَ الرُّكُوعِ وَبَعْدَهُ: حدیث:۱۰۰۲

نے خبر دی ہے کہ آپ نے رکوع کے بعد فرمایا تھا۔ اس کا جواب انس رضی اللہ عنہ نے یہ دیا کہ انہوں نے غلط سمجھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد صرف ایک مہینہ دعائے قنوت پڑھی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں سے ستر کے قریب قاریوں کو مشرکوں کی ایک قوم (بنی عامر) کی طرف تعلیم دینے کے لیے بھیجا، یہ لوگ ان مشروں کے علاوہ تھے جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی تھی ان میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان عہد تھا، لیکن انہوں نے عہد شکنی کی (اور قاریوں کو مار ڈالا) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینہ تک (رکوع کے بعد) قنوت پڑھتے رہے ان پر بد دعا کرتے رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رعل، ذکوان، عصیہ اور بنو لحیان قبائل کے کچھ لوگ آئے اور یقین دلایا کہ وہ لوگ اسلام لا چکے ہیں اور انہوں نے اپنی کافر قوم کے مقابل امداد اور تعلیم و تبلیغ کے لیے آپ سے مدد چاہی۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر انصاریوں کو ان کے ساتھ کر دیا۔ انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم انہیں قاری کہا کرتے تھے۔ وہ لوگ دن میں جنگل سے لکڑیاں جمع کرتے اور رات میں نماز پڑھتے رہتے۔ یہ حضرات ان قبیلہ والوں کے ساتھ چلے گئے، لیکن جب بئر معونہ پر پہنچے تو انہیں قبیلہ والوں نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ دغا کیا اور انہیں شہید کر ڈالا۔

((فَقَنَتَ شَهْرًا يَدْعُو عَلَى رِعْلٍ وَذَكْوَانَ وَبَنِي لِحْيَانَ))[1]

ترجمہ: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک (نماز میں) قنوت پڑھی اور رعل و ذکوان اور بنو لحیان کے لیے بد دعا کرتے رہے۔"

واقعہ بئر معونہ کے بعد ایک مہینہ تک نماز میں رکوع کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت پڑھی اور اس میں رعل وذکوان، عصیہ و بنی لحیان کے لیے بد دعا کی، اور تمام روایتیں بھی اس پر متفق ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قاتلین پر ایک مہینہ تک نماز فجر میں رکوع کے بعد بد دعا اور لعنت کی، پھر موقوف کر دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ قنوت کی یہ ابتداء تھی، اس سے پہلے ہم لوگ قنوت نہیں کرتے تھے۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مہینہ تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا پڑھی۔ ایک مہینہ کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک کر دیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وجہ پوچھی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاء کے لیے وجہ یہ بتائی کہ وہ آگئے اس لیے حاجت نہ رہی۔ اور مشرکین کے لیے بھی بد دعا ترک کی اس لیے کہ یہ آیت نازل ہوئی:

۱۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب العون بالمدد، حدیث:۲۸۹۹

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۹۹

((لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ))[1]

ترجمہ: "اے پیغمبر! آپ کے اختیار میں کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے یا عذاب دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں۔"

اب اس منع کے دو مطلب ہو سکتے ہیں یا تو اس خاص گروہ پر بد دعا سے منع کیا گیا، یا پھر مطلقاً اس قسم کی دعا سے ہی منع کر دیا گیا۔ صحیح یہ ہے کہ مطلق امتناع نہ تھا بلکہ ضرورت کے وقت اس قسم کی دعا مشروع رہی اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل اس پر دال ہے۔[2]

جب مسیلمہ کذاب سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت میں جنگ ہوئی تو انہوں نے قنوت میں دعا کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب سے مقابلہ کے وقت قنوت میں دعا کی۔ اسی طرح حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگ ہوئی تو دونوں نے قنوت میں دعا کی۔

باقی رہا قنوت پڑھنے اور نہ پڑھنے کا مسئلہ تو صاحب اصح السیر اس کے متعلق مختلف روایتیں نقل کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"جو صحابہ سے قنوت کرنے اور نہ کرنے کی بظاہر متضاد روایتیں آتی ہیں اس کا صحیح محمل یہی ہو سکتا ہے کہ وہ فجر میں ہمیشہ قنوت نہیں کرتے تھے لیکن ابتلاء اور مصیبت کے وقت کرتے تھے۔"[3]

اب رہا یہ مسئلہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز میں قنوت کی دعا قرات کے اختتام پر پڑھی تھی یا رکوع کے بعد کا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دونوں روایات ملتی ہیں کہ (دونوں صحیحین کی ہیں) قرات کے اختتام پر پڑھنے کی بھی اور رکوع کے بعد کی بھی۔ جبکہ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم "سمع اللہ لمن حمدہ" کہہ لیتے "تو یہ دعا پڑھتے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔[4]

ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث بیان کی کہ:

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:قَنَتَ بَعْدَ الرَّكْعَةِ، فِي صَلَاةٍ، شَهْرًا.إِذَا قَالَ "سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ "يَقُولُ فِي قُنُوتِهِ "اللَّهُمَّ! أَنْجِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ.اللَّهُمَّ! نَجِّ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ. اللَّهُمَّ! نَجِّ عَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ. اللَّهُمَّ! نَجِّ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ.اللَّهُمَّ! اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ.اللَّهُمَّ! اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ."

۱۔ آل عمران:۳/۱۲۸

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۰

۳۔ ایضاً، ص:۲۰۱

۴۔ ایضاً

قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ :ثُمَّ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَكَ الدُّعَاءَ بَعْدُ .فَقُلْتُ :أُرَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تَرَكَ الدُّعَاءَ لَهُمْ .قَالَ فَقِيلَ :وَمَا تراهم قد قدموا؟))[1]

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ نے ایک مہینے تک رکوع کے بعد قنوت (عاجزی سے دعا) کی، جب آپ سمع اللہ لمن حمدہ کہہ لیتے تو اپنی قنوت میں یہ الفاظ کہتے: اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات دے، اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے، اے اللہ کمزور سمجھے جانے والے دوسرے مومنوں کو نجات عطا کر، اے اللہ! مضر پر اپنے روندنے کو سخت تر کر اور اسے ان پر، یوسف علیہ السلام کے زمانے کے قحط کے مانند کر دے"۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے یہ دعا چھوڑ دی، میں نے ساتھیوں سے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا چھوڑ دی ہے۔ کہا: جواب میں مجھ سے کہا گیا، تم انھیں دیکھتے نہیں، جن کے لیے دعا ہوئی تھی وہ سب آ چکے ہیں۔

صاحب اصح السیر بھی تمام دلائل ذکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فجر کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی۔[2]

تمام دلائل و براہین کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ: حضور ﷺ نے ایک مہینہ تک فجر کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی تھی۔

۲۔ قنوت فی الفجر:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قنوت نازلہ کس نماز میں پڑھی جائے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ آپ ﷺ سے صبح کی نماز کی آخری رکعت میں رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھنا ثابت ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ امام جہر سے پڑھے اور مقتدی آمین کہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں مگر وہ جہر نہیں کہتے۔[3]

صاحب اصح السیر کہتے ہیں کہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "زاد المعاد" میں امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے مذہب کی نہایت بسط سے تردید کی ہے۔[4] اور ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

"یہ امر محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزانہ صبح کے وقت جہر سے (اللَّهُمَّ اهدِنِي فيمَن هَدَيتَ)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب اسْتِحْبَابِ الْقُنُوتِ فِي جَمِيعِ الصَّلاَةِ...، حدیث:۱۵۷۴، ص:۲/۱۳۵

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۲

۳۔ ایضاً

۴۔ ابن قیم، زاد المعاد، ص:۱/۲۶۲

الخ پڑھا ہو، صحابہ برابر آمین کہتے ہوں، پھر وفات تک آپ ﷺ کا یہ دستور رہا ہو اور جمہور صحابہ بلکہ کل صحابہ اس کو بھول جائیں اور یہاں تک بعض مکروہ اور بعض بدعت کہیں۔"

اسی طرح "دار قطنی" میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

((أَشْهَدُ أَنِّي سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُولُ: إِنَّ الْقُنُوتَ فِي صَلَاةِ الصُّبْحِ بِدْعَةٌ))(۱)

ترجمہ: میں شاہد ہوں حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ قنوت صلاۃ فجر میں بدعت ہے۔

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ شافعیہ کی مکمل دلیل اس مسئلہ میں واضح روایت ابن ابی فدیک کی ہے وہ عبد اللہ بن سعید المقری رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں جب رکوع سے سر اٹھاتے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھتے:

((اللَّهُمَّ اهدِنِي فيمَن هَدَيتَ، وعافِنِي فيمَن عافَيتَ، وتَوَلَّنِي فيمَن تَوَلَّيتَ، وبارِكْ لِي فيما أعطَيتَ، وقِنِي شَرَّ ما قَضَيتَ، إنَّكَ تَقضِي ولا يُقضَى عَلَيكَ، وإنَّه لا يَذِلّ مَن والَيتَ، ولا يَعِزُّ مَن عادَيتَ، تَبارَكتَ رَبَّنا وتَعالَيتَ))(۲)

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ یہ روایت قابلِ احتجاج بھی نہیں ہے کیونکہ عبد اللہ بن سعید المقری منکر الحدیث ہیں۔(۳)

صاحب اصح السیر مزید لکھتے ہیں کہ شافعیہ کی دوسری دلیل ابو جعفر رازی کی ہے وہ ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((يَقنُتُ فی صَلاةِ الغَداةِ حَتَّى فارَقَ الدُّنيا))(۴)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ صبح کی نماز میں قنوت کیا حتیٰ کہ آپ ﷺ نے دنیا چھوڑ دی۔

اس حدیث کے متعلق صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ:

اول: تو ابو جعفر رازی مناکیر میں سے ہیں اس لیے ان کی روایت حجّت نہیں ہے۔

دوم: اس روایت میں یہ بھی نہیں کہ قنوت سے دعا خاص مراد ہے یا تعدیل ارکان۔

سوم: یہ کہ عاصم کہتے ہیں کہ میں نے جب انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایک جماعت کہتی ہے کہ رسول اللہ

۱۔ دار قطنی، علی بن عمر أبو الحسن، سنن الدار قطنی، باب صفة القنوت وبيان موضعه، (دار المعرفہ بیروت، ۱۳۸۶ھ، ۱۹۶۶ء،) ص:۲/۴۱، (قلت (دار قطنی): وإسناده صحیح, و قال الترمذی: حدیث حسن صحیح)

۲۔ أبو داؤد، سنن ابو داؤد، باب القنوت في الوتر، حدیث:۱۴۲۵، حدیث صحیح

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۳

۴۔ دار قطنی، سنن الدار قطنی، ص:۲/۳۹

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہمیشہ فجر کی نماز میں قنوت پڑھتے تھے۔ تو فرمایا کہ جھوٹ کہتے ہیں، رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے صرف ایک مہینہ قنوت پڑھا۔[1]

آخر میں صاحب اصح السیر قائلین کے دلائل کا رد کرنے کے بعد قنوت فی الفجر کے بارے میں ائمہ کرام کی مختلف آراء کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"فقہاء خاص دعا کو قنوت کہتے ہیں۔ جب کہ صحابہ تعدیل ارکان اور طول قیام کو قنوت کہتے تھے اور کبھی قنوت میں خاص دعا کا ذکر بھی کرتے تھے اس فرق کو پیش نظر رکھ کر تمام روایتیں دیکھو تو کچھ اختلاف باقی نہیں رہتا۔"[2]

صاحب اصح السیر کی رائے بھی فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھے جانے کے قائلین کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان کے دلائل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان دلائل کی بنیاد پر ان کی رائے کمزور ہے۔ لہٰذا اچھی طرح تحقیق و توضیح کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مانعین کے دلائل کی بنیاد صحیح احادیث ہیں۔ اور قابلِ حجّت ہیں۔

غزوۂ بنی المصطلق:

غزوۂ بنی المصطلق کے واقعات سے اخذ کردہ مندرجہ ذیل فقہی مسائل کو ذکر کیا جارہا ہے۔

۳۔ تیمم کے حکم کا نزول:

تیمم کا لغوی معنی "قصد اور ارادہ" کرنا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں تیمم کے معنی چہرے اور کہنیوں سمیت بازوؤں پر پاک صاف مٹی کے ساتھ ہاتھ پھیرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاک مٹی پر ہاتھ رکھا جائے اور پھر اس ہاتھ کو چہرہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔ شریعت میں تیمم کا حکم اُس وقت ہے جب نماز اور دیگر امور کی بجا آوری کے لیے پانی دستیاب نہ ہو۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُواْ مَاءً فَتَيَمَّمُواْ صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ﴾[3]

ترجمہ: "اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم نے عورتوں سے قربت مجامعت کی ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو (اندریں صورت) پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو۔ پس

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۰۳

۲۔ ایضاً، ص:۲۰۴

۳۔ المائدہ:۵/۶

تیمم یہ ہے کہ اس پاک مٹی سے اپنے چہروں اور اپنے پورے ہاتھوں کا مسح کر لو۔"

صاحب اصح السیر تیمم کے حکم کے نزول کی فقہی بحث کو قصّہ افک کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ غزوۂ بنی المصطلق کی طرف جاتے ہوئے مقامِ بیداء یا ذات الجیش پر یہ واقعہ پیش آیا اور اسی دوران پانی کی تنگی کی وجہ سے آیتِ تیمم نازل ہوئی جس کو تفصیلاً اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ:

((خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ، حَتَّى إِذَا كُنَّا بِالْبَيْدَاءِ، أَوْ بِذَاتِ الْجَيْشِ، انْقَطَعَ عِقْدٌ لِي،... مَا هِيَ بِأَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا آلَ أَبِي بَكْرٍ، قَالَتْ: فَبَعَثْنَا الْبَعِيرَ الَّذِي كُنْتُ عَلَيْهِ، فَأَصَبْنَا الْعِقْدَ تَحْتَهُ))[۱]

ترجمہ: "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بعض سفر (غزوہ بنی المصطلق) میں تھے۔ جب ہم مقام بیداء یا ذات الجیش پر پہنچے تو میرا ایک ہار کھو گیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی تلاش میں وہیں ٹھہر گئے اور لوگ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ٹھہر گئے۔ لیکن وہاں پانی کہیں قریب میں نہ تھا۔ لوگ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا "عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا کام کیا؟ کہ رسول اللہ ﷺ اور تمام لوگوں کو ٹھہرا دیا ہے اور پانی بھی کہیں قریب میں نہیں ہے اور نہ ہی لوگوں کے ساتھ ہے۔ پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے، رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک میری ران پر تھا۔ اس وجہ سے میں حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ جب صبح کے وقت اٹھے تو پانی کا پتہ تک نہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت اتاری اور لوگوں نے تیمم کیا۔ اس پر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہا "اے آل ابی بکر! یہ تمہاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے۔" عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ پھر ہم نے اس اونٹ کو ہٹایا جس پر میں سوار تھی تو ہار اسی کے نیچے مل گیا۔"

صاحب اصح السیر اس حدیث میں بیان کیے گئے قصّہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"تیمم کا حکم آلِ ابی بکر کی برکات میں سے ایک برکت ہے۔ یعنی کہ یہ پہلی برکت نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے آلِ ابی بکر کی برکت سے اور آسانیاں بھی آچکی ہیں۔"[۲]

اس کے بعد صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ "صحیحین" کی روایت میں یہ نہیں کہ یہ قصّہ کس غزوہ کا ہے۔ اس کے متعلق فقہاء ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔

۱۔ بخاری، صحیح بخاری، كتاب التيمم، باب وقول الله تعالى فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا، حدیث: ۳۲۷

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۲۰

صاحب اصح السیر میں بیان کی گئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ میرا مالا گم ہوا جس پر اہلِ افک کو جو کچھ کہنا تھا کہا، اس کے بعد پھر دوسرے سفر میں ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے اور میرا مالا گم ہو گیا۔ اسکے بعد تیمم کے نزول کا قصّہ ہے، اس سے صریح معلوم ہو گیا کہ یہ کسی دوسرے غزوہ کا قصّہ ہے اور یہی ظاہر ہے۔ واللہ اعلم"(۱)

حکمِ تیمم کے نزول کے بارے میں اس حدیث کی وجہ سے واضح ہے کہ آیتِ تیمم اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی پریشانی کی برکت سے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے اللہ کی طرف سے آسانی ہے۔ اور یہ واقعہ قصّہ افک کے بعد کا ہے یعنی کہ غزوۂ بنی المصطلق کی طرف جاتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا جیسا کہ اوپر حدیث میں گزر چکا ہے یا کسی اور غزوہ کی طرف جاتے ہوئے اس پر احادیث میں زیادہ وضاحت نہیں۔ واللہ اعلم بالثواب

صاحب اصح السیر تیمم کی بحث میں صرف تیمم کے حکم کے نزول سے متعلق بحث کرتے ہیں اس اختلاف کے ساتھ کہ یہ حکم کس غزوہ میں نازل ہوا۔ اس سے آگے مسئلہ تیمم یعنی تیمم کے طریقہ وغیرہ کو یہاں بیان نہیں کرتے محض تیمم کے حکم کے نزول پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

کتاب میں مکمل تفصیل مذکور نہیں ہے اور مکمل تفصیل کے لئے حاشیہ(۲) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۲۱

۲۔ تیمم کے متعلق تفصیل:

تیمم کے مشروع ہونے کی حکمت:

تیمّم کے مشروع ہونے کی ایک حکمت یہ ہے کہ: امّت محمدی کے لیے اسانی پیدا کی جا سکے۔ بعض اوقات پانی کے استعمال سے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے، جیسے بیماری وغیرہ اور عبادت کے ساتھ مسلسل جڑے رہنے کی وجہ سے تا کہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے بھی عبادت سے دوری واقع نہ ہو۔

تیمّم کب کرنا چاہیے:

جب پانی نہ ملے تو تیمّم کر لینا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان عالی شان ہے کہ: "اور جب تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمّم کر لو" پانی نہ ملنے سے مراد یہ ہے کہ ڈھونڈنے کے بعد بھی نہ ملے۔ جب انسان پانی کے استعمال سے عاجز ہو تو تیمّم کرے۔ جیسے بیمار یا وہ آدمی جو حرکت نہ کر سکتا ہو اور کوئی وضو کرنے میں اس کا معاون اور مددگار بھی نہ ہو۔ جب پانی کے استعمال کی وجہ سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو تیمم کر لے اور اس نقصان کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں۔

أ۔ وہ بیمار جس کی بیماری کا پانی کے استعمال کی وجہ سے بڑھ جانے کا خطرہ ہو۔

ب۔ اگر سخت سردی ہے اور پانی کو گرم کرنے کی کوئی چیز نہیں ہے "اور آدمی کا غالب گمان یہ ہے کہ اگر وہ اس پانی سے وضو کرے گا تو بیمار ہو جائے گا تو اس کے لیے تیمم کرنا جائز ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو سخت سردی کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھائی اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خاموشی اختیار کی۔"

ج۔ اگر کسی آدمی کے پاس تھوڑا سا پانی ہے جو اس کے پینے کے لیے ہے، اس کے علاوہ اور پانی نہیں ہے تو تیمم جائز ہے۔

تیمّم کا طریقہ کار:

عکل و عرینہ:

عکل و عرینہ کے واقعہ سے اخذ کردہ مندرجہ ذیل فقہی مسائل کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

۴۔ماکول اللحم جانور کے پیشاب کا حکم:

صاحب اصح السیر سب سے پہلے عکل و عرینہ (عکل بضم عین مہملہ وسکون کاف، عرینہ بضم عین مہملہ وفتح رائے مہملہ) کی لغوی تحقیق بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ دونوں قبیلوں کا نام ہے۔ان کا قصہ صحیحین اور دوسری کتابوں میں تفصیلاً موجود ہے۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((أَنَّ نَاسًا مِنْ عُكْلٍ وَعُرَيْنَةَ، قَدِمُوا الْمَدِينَةَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَكَلَّمُوا بِالْإِسْلَامِ، فَقَالُوا: يَا نَبِيَّ اللهِ، ... مِنْ عُرَيْنَةَ وَقَالَ يَحْيَى بْنُ أَبِي كَثِيرٍ وَأَيُّوبُ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ عَنْ أَنَسٍ: قَدِمَ نَفَرٌ مِنْ عُكْلٍ))[1]

ترجمہ: "قبائل عکل و عرینہ کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مدینہ آئے اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر انہوں نے کہا: اے اللہ کے نبی! ہم لوگ مویشی رکھتے تھے، کھیت وغیرہ ہمارے پاس نہیں تھے، اس لیے ہم صرف دودھ پر بسر اوقات کیا کرتے تھے اور انہیں مدینہ کی آب و ہوا ناموافق آئی تو نبی کریم ﷺ نے کچھ اونٹ اور چرواہا ان کے ساتھ کر دیا اور فرمایا کہ ان اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیو تو تمہیں صحت حاصل ہو جائے گی وہ لوگ چراگاہ کی طرف گئے۔ لیکن مقام حرہ کے کنارے پہنچتے ہی وہ اسلام سے پھر گئے اور نبی کریم ﷺ کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو لے کر بھاگنے لگے۔ اس کی خبر جب آپ ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے چند صحابہ کو ان کے پیچھے دوڑایا۔ وہ انہیں پکڑ کر مدینہ لائے گئے۔ تو آپ ﷺ کے حکم سے ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دی گئیں اور ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے گئے اور انہیں حرہ کے کنارے چھوڑ دیا گیا۔ آخر وہ اسی حالت میں مر گئے۔ قتادہ نے بیان کیا کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ آپ ﷺ نے اس کے بعد صحابہ کو

دونوں ہاتھ مٹی میں مارے، پھر ان کو جھاڑے تاکہ غبار کم ہو جائے، پھر ان دونوں کے ساتھ ایک دفعہ چہرے کا مسح کرے اور پھر ہتھیلیوں کے ظاہر کا مسح کرے، دائیں ہاتھ سے بائیں ہتھیلی کے ظاہر کا مسح کرے اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے ظاہر کا مسح کرے۔

تیمم کے اس طریقے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو پھونکا (تاکہ جو خاک لگی ہو وہ اڑ جائے) پھر آپ ؐ نے ان دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر اور ہاتھوں پر پھیر لی"

۱۔ بخاری، صحیح بخاری، كتاب المغازي، باب قصة عكل وعرينة، حدیث:۳۹۵۶

صدقہ کا حکم دیا اور مثلہ سے منع فرمایا اور شعبہ، ابان اور حماد نے قتادہ سے بیان کیا کہ یہ لوگ عرینہ کے قبیلے کے تھے اور یحییٰ بن ابی کثیر اور ایوب نے بیان کیا 'ان سے ابو قلابہ نے اور ان سے انس رضی اللہ عنہ نے کہ قبیلہ عکل کے کچھ لوگ آئے۔

پورا قصّہ اوپر حدیث میں گزر چکا ہے خلاصہ یہ ہے کہ عکل و عرینہ کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور مسلمان ہوئی۔ مدینہ کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی اور وہ بیمار ہوگئے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں علاج کے طور پر جانوروں کا دودھ اور پیشاب پینے کا کہا اور وہ اس سے ٹھیک ہوگئے۔ لیکن پھر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راعی کو قتل کر کے جانور لے کر بھاگ گئے اور پھر مرتد ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو ان کا تعاقب کیا اور انہیں پکڑ کر سملِ عین (راعی کے قصاص میں ان کی آنکھوں میں سلائی پھیری) کیا اور ہاتھوں اور پیروں کو کٹوا کر صحرا میں چھوڑ دیے گئے اور وہیں مر گئے۔[1]

اس واقعے سے صاحبِ اصح السیر دو فقہی مسئلوں کا استنباط کرتے ہیں۔

پہلا مسئلہ: مختلف ذنوب کے لیے متعدد سزاؤں کا جمع کرنا جائز ہے۔ اور یہ کہ محارب کے ہاتھ پیر کو ایک ساتھ قطع کرنا جائز ہے۔[2]

دوسرا مسئلہ: دوا کے لیے ماکول اللحم جانور کا پیشاب پینا جائز ہے۔ "گو اس میں بڑا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں یہ حکم ان ہی کم بختوں کے لیے مخصوص تھا۔" واللہ اعلم۔

اس مسئلہ کی تحقیق اور توضیح کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مرتد کافر تھے، چور تھے اور انہوں نے چرواہے کی آنکھ میں سلائی بھی پھیری تھی اس لیے تمام گناہوں کی سزا کو جمع کیا گیا جو کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اس سے معلوم ہوا کہ متعدد سزاؤں کا جمع کرنا جائز ہے۔ اور یہ بھی کہ محارب کے ہاتھ پاؤں کو ایک ساتھ قطع کرنا بھی جائز ہے۔[3]

ابنِ قیم ایک اور طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

((وَفِيهَا مِنَ الْفِقْهِ جَوَازُ شُرْبِ أَبْوَالِ الْإِبِلِ،وَطَهَارَةُ بَوْلِ مَأْكُولِ اللَّحْمِ،وَالْجَمْعُ لِلْمُحَارِبِ إِذَا أَخَذَ الْمَالَ وَقَتَلَ بَيْنَ قَطْعِ يَدِهِ وَرِجْلِهِ وَقَتْلِهِ،وَأَنَّهُ يُفْعَلُ بِالْجَانِي كَمَا فَعَلَ فَإِنَّهُمْ لَمَّا سَمَلُوا عَيْنَ الرَّاعِي سَمَلَ أَعْيُنَهُمْ،وَقَدْ ظَهَرَ بِهَذَا أَنَّ الْقِصَّةَ مُحْكَمَةٌ،لَيْسَتْ مَنْسُوخَةً،وَإِنْ كَانَتْ قَبْلَ أَنْ تَنْزِلَ الْحُدُودُ،وَالْحُدُودُ نَزَلَتْ بِتَقْرِيرِهَا لَا بِإِبْطَالِهَا. وَاللَّهُ أَعْلَمُ))[4]

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۴۴

۲۔ ایضاً، ص:۲۴۵

۳۔ ایضاً

۴۔ ابن قیم، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، ص:۳/۲۵۵

مفہوم: اس عبارت میں ابنِ قیم ایک اور طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اگر چہ یہ قصّہ حدود کے نزول سے پہلے کا ہے مگر حدود کی وجہ سے منسوخ نہیں ہوا، اس لیے کہ حدود نے سزا کو معین کیا ہے منسوخ نہیں کیا۔"

اس کا مطب یہ ہے کہ یہ حکم آج تک اسی طرح ہے منسوخ نہیں ہوا لہٰذا آج بھی اگر حاکم متعدد سزاؤں کو جمع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اور اس قصّہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بطورِ دوا ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب پینا جائز ہے۔[1] اگر چہ اس میں اختلاف بہت ہے۔ بعض کے نزدیک یہ حکم صرف ان ہی کم بختوں کے لیے مخصوص تھا۔ صاحب اصح السیر نے اس اختلاف کو نہیں چھیڑا اس لیے میں نے بھی اسی پر اکتفا کیا جتنا کہ انہوں نے بیان کیا ہے۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ بطورِ دوا اور بقدرِ دوا ماکول اللحم جانور کا پیشاب پینا جائز ہے۔

غزوۂ خیبر:

صاحبِ اصح السر نے غزوہ خیبر سے بہت سے احکام فقہیہ پر استدلال کیا ہے۔ ان مندرجہ ذیل فقہی مسائل کو ذکر کیا جارہا ہے۔

۵۔ مخابرہ:

زمین کو آدھی یا تہائی یا چوتھائی پیداوار پر بٹائی پر دینا مخابرہ کہلاتا ہے۔ "مخابرہ" خیبر سے ماخوذ ہے، یعنی خیبر کی زمینوں کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اس کو "مخابرہ" کہتے ہیں۔

مخابرہ کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ:

((أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَجْلَى الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ، وَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَمَّا ظَهَرَ عَلَى خَيْبَرَ،... نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلَى ذَلِكَ مَا شِئْنَا.فَقَرُّوا بِهَا حَتَّى أَجْلَاهُمْ عُمَرُ إِلَى تَيْمَاءَ وَأَرِيحَاءَ))[2]

ترجمہ: "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو سرزمین حجاز سے نکال دیا تھا اور جب نبی کریم ﷺ نے خیبر پر فتح پائی تو آپ ﷺ نے بھی یہودیوں کو وہاں سے نکالنا چاہا تھا۔ جب آپ کو وہاں فتح حاصل ہوئی تو اس کی زمین اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی ہو گئی تھی۔ آپ کا ارادہ یہودیوں کو وہاں سے باہر کرنے کا تھا، لیکن یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہمیں یہیں رہنے دیں۔ ہم سارا کام خود کریں گے اور اس کی پیداوار کا نصف حصہ لے لیں گے۔ اس پر

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۴۵

۲۔ بخاری، صحیح بخاری، كتاب المزارعة، باب إذا قال رب الأرض أقرك ما أقرك الله ولم يذكر...، حدیث: ۲۲۱۳

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا جب تک ہم چاہیں تمہیں اس شرط پر یہاں رہنے دیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ وہیں رہے اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں تیماء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کر دیا۔"

غزوۂ خیبر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی زمین کے سلسلہ میں رسول ﷺ کا ایک اور عمل مخابرہ تھا۔ پورا واقعہ اوپر حدیث میں بیان کیا جا چکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فتح خیبر سے حاصل ہونے والی زمین یہودیوں نے حضور ﷺ سے اس شرط پر لے لی کہ وہ اسے آباد کریں گے اور درختوں کی خدمت کریں گے اور زراعت میں سے جو پیداوار ہوگی۔ اس میں سے نصف ان کا حصّہ ہوگا۔ صاحبِ اصح السیر کہتے ہیں اس کو مخابرہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس طرح کا معاملہ سب سے پہلے خیبر میں ہوا۔[1]

صاحبِ اصح السیر مخابرہ کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ کسی روایت سے نہیں معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ نے بیج دینے کا وعدہ کیا ہو یا دیا ہو۔ بظاہر بیج اور عمل اہلِ خیبر کا تھا اور زمین مسلمانوں کی اس سے معلوم ہوا کہ ربّ الارض کو بیج دینا لازم نہیں ہے۔"[2]

مخابرہ کے اس مسئلہ میں تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ربّ الارض پر بیج دینا لازم نہیں (جیسا کہ کسی حدیث میں اس کی وضاحت نہیں ملتی)۔ زمین کی پیداوار کے نصف حصّہ کے لیے زمین کا مالک ہونا ہی کافی ہے۔ لیکن اگر ربّ الارض باہمی رضامندی سے بیج دینے پر راضی ہو جائے تو بھی ٹھیک ہے جیسا کہ آج کل کا عرف ہے۔

۶۔ ممنوعاتِ خیبر:

صاحبِ اصح السیر مکحول کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ خیبر میں چار چیزیں منع کی گئیں۔

۱۔ سبایا میں اگر حاملہ عورتیں ہوں تو ان سے صحبت کرنے سے منع کیا گیا۔

۲۔ اہلی گدھے کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا۔

۳۔ درندوں کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا۔

۴۔ غنیمت کا مال جب تک تقسیم نہ ہو جائے اس کے بیچنے سے منع کیا گیا۔[3]

۷۔ قتال شہر حرام:

صاحبِ اصح السیر بیان کرتے ہیں کہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ غزوۂ خیبر کے لیے حضور ﷺ محرم میں نکلے یعنی

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۷۳

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص:۲۸۱

ابتداء سن ۷ ہجری میں ہوئی تو معلوم ہوا کہ شہر حرام میں قتال ممنوع نہیں ہے۔ اگر ابتداء کفار کی طرف سے ہو تو بالاتفاق مسلمانوں کے لیے بھی قتال جائز ہے۔

اب اختلاف یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ابتداء کرنی جائز ہے یا نہیں۔ ائمہ اربعہ کہتے ہیں کہ جائز ہے اور نہی منسوخ ہے۔[۱] لیکن عطاء رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کہتے ہیں کہ منسوخ نہیں ہے منع ہے۔ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ قسم کھاتے تھے کہ شہر حرام میں قتال حرام ہے، اور تحریم منسوخ نہیں ہوئی ہے۔[۲] اور کہتے ہیں کہ جمہور کا استدلال غزوۂ خیبر سے درست نہیں ہے، اس لیے کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکلے آخر محرم میں تھے لیکن غزوۂ صفر میں ہوا۔ اور محاصرۂ طائف سے استدلال صحیح ہے (لیکن وہ استدلال تام نہیں ہے جیسا کہ وہاں معلوم ہو گا)۔ اس لیے کہ طائف کا محاصرہ بیس روز سے زیادہ ہوا، اور آخری ایّام ذیقعدۂ کے تھے۔[۳] واللہ اعلم

اس پورے اختلاف سے صاحب اصح السیر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"یہ معلوم ہو چکا ہے کہ غزوۂ خیبر کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم محرم میں نکلے یعنی ابتداء سن ۷ ہجری میں ہوئی تو معلوم ہوا کہ شہر حرام میں قتال ممنوع نہیں ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کفار کی طرف سے ابتداء ہو تو مسلمانوں کو بھی قتال جائز ہو جاتا ہے۔"[۴]

اس مسئلہ میں صاحب اصح السیر کی رائے بہت پسند آئی ہے کہ اگر ابتداء کفار کی طرف سے ہو تو مسلمانوں کے لیے قتال جائز ہے۔ لیکن مسلمانوں کو شہر حرام میں ابتداء نہیں کرنی چاہیے۔ باقی کیونکہ صاحب اصح السیر نے اس مسئلہ کے اختلاف کو تفصیلاً ذکر نہیں کیا اس لیے جتنا انہوں نے ذکر کیا ہے اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

9۔ تحریم لحوم الحمر اہلیہ:

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ بسند جید ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں اہلی گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ وہ نجس ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے کہا کہ منع اس لیے ہوا کہ سواری کا جانور ہے۔ بعض نے کہا کہ اطراف کی پلیدی کھاتا ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نجس ہے۔

چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ، وَعَنْ أَكْلِ لُحُومِ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۸۱

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

الْحُمُرِ الْإِنْسِيَّةِ))[1]

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے، اور پالتو گدھوں کے گوشت کھانے سے منع فرمادیا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر سے پہلے پالتو گدھے کا گوشت کھایا جاتا تھا۔

صاحب اصح السیر اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"فرمایا رسول ﷺ نے کہ گوشت پھینک دو اور برتن توڑ دو مگر ایک شخص نے کہا کہ یا رسول ﷺ! گوشت پھینک دیا جائے اور برتن دھو دیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا دھو دو، پہلا حکم عمل سے قبل منسوخ ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ برتن کی نجاست دھونے سے زائل ہو جاتی ہے۔"[2]

اس ساری بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ خیبر میں ہی اہلی گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا اور یہ کہ برتن توڑنے کا حکم بھی قبل از عمل دھونے کے حکم کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔

۱۰۔ متعہ کا حکم:

اس کے بعد صاحب اصح السیر متعہ کے حرام ہونے کی بحث کو تفصیلاً ذکر کرتے ہیں۔ اور متعہ کے حکم کے ممنوع ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو ذکر کرتے ہیں کہ:

((إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمُتْعَةِ وَعَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ زَمَنَ خَيْبَرَ))[3]

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ نے متعہ اور پالتو گدھے کے گوشت سے جنگ خیبر کے زمانہ میں منع فرمایا تھا"

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح متعہ

کو خیبر میں منع فرمایا۔ اور اہلی گدھوں کے گوشت کو، اس سے قبل نکاح متعہ جائز تھا، نکاح متعہ یہ ہے کہ مدّتِ معیّنہ کے لیے مہرِ معینہ پر نکاح کیا جائے۔[4]

۱۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب المغازي، باب غزوة خيبر، حدیث:۳۹۷۹

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۴۵

۳۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب نهي رسول الله صلى الله عليه و سلم عن نكاح المتعة آخرا، حدیث:۴۸۲۵

۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۴۵

آگے صاحب اصح السیر حضرت ابن ابی عمرة انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ متعہ اسلام میں جب تک جائز تھا صرف اضطراری حالت میں ہی جائز تھا۔ جیسا کہ ان احادیث سے ثابت ہے۔

ابن ابی عمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

((إِنَّهَا كَانَتْ رُخْصَةً فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ لِمَنِ اضْطُرَّ إِلَيْهَا.كَالْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَلَحْمِ الْخِنْزِيرِ.ثُمَّ أَحْكَمَ اللَّهُ الدِّينَ وَنَهَى عَنْهَا))[۱]

ترجمہ:"بلاشبہ یہ ایسا کام ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایسے شخص کے لئے جو (حالات کی بنا پر) اس کے لئے مجبور کر دیا گیا ہو، اس کی رخصت تھی جس طرح مجبوری میں مردار، خون اور سور کے گوشت کے لیے ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو محکم کیا اور اس سے منع فرما دیا۔"

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ:

((كُنَّا نَغْزُو مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وليس لنا شيء فقلنا ألا نستخصي؟ فنهانا عن ذلك،ثم رخص لنا أن ننكح المرأة بالثوب،ثم قرأ علينا:يا أيها الذين أمنوا لا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ ولا تعتدوا أن الله لا يحب المعتدين))[۲]

ترجمہ:"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے تھے اور ہمارے ساتھ (عورتیں نہیں ہوتی تھیں) کچھ نہیں تھا، ہم نے عرض کیا: کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متعہ کرنے کی رخصت عطا فرمائی، ہم میں سے کوئی شخص کپڑے کے عوض ایک مدت تک کسی عورت سے نکاح کرتا، پھر عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:"اے مومنو! پاکیزہ چیزوں کو، جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، حرام قرار نہ دو۔"

صاحب اصح السیر حضرت ابن ابی عمرة انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی احادیث جو کہ اوپر گزر چکی ہیں سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"اس میں شبہ نہیں کہ ابتدائے اسلام میں نکاح متعہ کی رخصت تھی بشرط یہ کہ ضرورت شدید ہو، جیسے مردہ اور سور کا گوشت کھانے کی جان بچانے کے لیے رخصت ہے، اسی طرح اضطرار کی حالت میں اس کی بھی رخصت تھی۔"[۳]

۱۔ مسلم، صحیح مسلم، كتاب النكاح، باب نِكَاحِ الْمُتْعَةِ وَبَيَانِ أَنَّهُ أُبِيحَ ثُمَّ نُسِخَ ثُمَّ أُبِيحَ ثُمَّ نُسِخَ ....، حدیث:۳۴۹۵

۲۔ بخاری، صحیح بخاری، كتاب النكاح، باب ما يكره من التبتل والخصاء، حدیث:۴۷۸۷

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۸۳

آگے صاحب اصح السیر حضرت جابر بن عبد اللہ کی وہ روایت بیان کرتے ہیں جس سے قائلین متعہ استلال کرتے ہیں۔

ابو نضرہ سے روایت ہے۔ میں جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا کہ ان کے پاس ایک آنے والا آیا اور کہنے لگا کہ:
((ابْنُ عَبَّاسٍ وَابْنُ الزُّبَيْرِ اخْتَلَفَا فِي الْمُتْعَتَيْنِ فَقَالَ جَابِرٌ فَعَلْنَاهُمَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم ثُمَّ نَهَانَا عَنْهُمَا عُمَرُ فَلَمْ نَعُدْ لَهُمَا))[1]

ترجمہ: "حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے دونوں متعتوں (حج تمتع اور نکاح متعہ) کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں وہ دونوں کام کیے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں ان دونوں سے منع کر دیا، پھر ہم نے دوبارہ ان کا رخ نہیں کیا۔"

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے رخصت مروی ہے۔ اس میں یہ تشریح نہیں کہ یہ رخصت کس حالت میں تھی مگر ظاہر ہے کہ وہ بھی ضرورت پر محمول ہو گی، مگر اس کے بعد یہ رخصت ممنوع ہو گئی اس پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے سوائے اس بدعتی روافض کے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اضطرار کی حالت میں جواز کا فتویٰ دیتے تھے مگر پھر انہوں نے بھی رجوع کیا اور سب کی طرح حرام کہنے لگے۔[2]

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ اصل اختلاف اس میں ہے کہ متعہ کب حرام ہوا، بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ غزوۂ خیبر میں، بعض کہتے ہیں کہ عمرۃ القضاء میں، بعض کہتے ہیں کہ غزوۂ اوطاس میں اور بعض کہتے ہیں حجۃ الوداع میں حرام ہوا۔ اس میں عام، اوطاس اور فتح مکہ کا تو ایک ہی زمانہ ہے۔[3]

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع اور عمرۃ القضاء کا منع اس پر محمول ہو سکتا ہے کہ پہلے منع کی تاکید تھی اور اعلان منع جدید تھا۔ اس لیے اصل اختلاف رہ جاتا ہے خیبر اور فتح مکہ کا، جبکہ فتح مکہ میں صرف اعلان اور تاکید نہیں تھا بلکہ وہاں اجازت اور فعل تھا۔[4]

پھر صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ جو صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (یہ روایت اوپر گزر چکی ہے) کہ منع کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ سے خیبر میں اور اہلی گدھوں کے گوشت سے، یہ روایت متعدد طریقوں سے اعلیٰ سند کے ساتھ مروی ہے اور اس میں شبہ کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ متعہ خیبر میں منع ہوا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ صحیح طریقوں

۱۔ مسلم، صحیح مسلم، کتاب النكاح، باب نِكَاحِ الْمُتْعَةِ وَبَيَانِ أَنَّهُ أُبِيحَ ثُمَّ نُسِخَ ثُمَّ أُبِيحَ ثُمَّ نُسِخَ ...، حدیث:۳۴۸۳، ص:۴/۱۳۱
۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۸۲
۳۔ ایضاً، ص:۲۸۳
۴۔ ایضاً، ص:۲۸۳

سے مسلم میں یہ روایت ہے کہ اس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں متعہ کی اجازت دی اور تین روز کے بعد منع فرمایا۔ لہٰذا شبہ ہوا کہ اگر خیبر میں حرام ہو گیا تھا تو پھر یہ اجازت کیسی تھی۔ [1]

آگے فرماتے ہیں کہ تمام شبہات اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ خیبر کے امتناع کو حرمتِ شرعی پر محمول کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے حرمت کا مفہوم متعیّن ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے متعہ سے منع فرمایا۔ لیکن کسی روایت سے یہ پتہ نہیں ملتا کہ یہ امتناع حرمت کی وجہ سے تھا یا مصلحت کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ ابن ابی عمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اس بات پر صریح ہے کہ جب ابتدائے اسلام میں رخصت تھی تو وہ رخصت بھی عام نہ تھی بلکہ اضطرار کی حالت میں رخصت تھی۔ لہٰذا ابلا اضطرار تو اس وقت بھی منع ہی تھا۔ [2]

صاحبِ اصح السیر اس سارے اختلاف سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

> "غزوۂ خیبر میں نکاح متعہ سے منع کیا گیا تھا۔ صرف عام اوطاس میں تین دن متعہ کی اجازت دی گئی۔ لیکن فتح مکہ کے روز حضور ﷺ صاف طور پر متعہ کا حرام مؤبد ہونا بیان کر دیا۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ اس سے پہلے آپ ﷺ کو خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں ملا تھا بلکہ آپ ﷺ نے خود اس فعل کو مکروہ سمجھ کر منع کیا تھا اور بوقتِ ضرورت اجازت دی۔ لیکن جب فتح مکہ کے وقت حکم خداوندی آ گیا تو من جانب اللہ حرام ہونا بیان کر دیا۔" [3]

اس ساری بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعہ ابتدائے اسلام میں بھی حالتِ اضطرار میں ہی جائز تھا۔ جیسا کہ ابن ابی عمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے یعنی کہ اس کی عام رخصت کا نہ ہونا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں تھا۔ اس لیے حضور ﷺ نے غزوۂ خیبر میں اس سے منع فرمایا جیسا کہ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے۔ اور پھر بعد میں حجۃ الوداع کے موقع پر من جانب اللہ اس کی حرمت ابدی کو آپ ﷺ نے بیان کر دیا۔

۱۱۔ اراضیٔ خیبر کی تقسیم:

صاحبِ اصح السیر فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کی تقسیم میں سب سے بڑی چیز زمین تھی۔ اس کی تقسیم حضور ﷺ نے کچھ اس طرح کی جیسا کہ: "ابوداؤد" میں بشر بن یسار سے مروی ہے کہ:

۱۔ ایضاً، ص: ۲۸۵

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۸۵

۳۔ ایضاً، ص: ۲۸۶

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ظَهَرَ عَلَى خَيْبَرَ،قَسَمَهَا عَلَى سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ سَهْمًا،جَمَعَ كُلُّ سَهْمٍ مِائَةَ سَهْمٍ،فَكَانَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،وَلِلْمُسْلِمِينَ النِّصْفُ مِنْ ذَلِكَ،وَعَزَلَ النِّصْفَ الْبَاقِيَ لِمَنْ نَزَلَ بِهِ مِنَ الْوُفُودِ، وَالْأُمُورِ، وَنَوَائِبِ النَّاسِ))[1]

ترجمہ:"جب آپ ﷺ نے خیبر فتح کر لیا تو اس کے چھتیس حصے کئے اور ہر حصہ میں سو حصے تھے۔ ان کے آدھے میں تو رسول اللہ ﷺ اور باقی مسلمانوں کا حصہ تھا اور جو آدھا باقی رہتا اس میں دوسری ضروریات مثلاً رفاہی کاموں کے لیے اور باہر سے آنے والے وفود کے لیے تھا۔"

صاحبِ اصح السیر علامہ عینی کے قول سے استدلال کرتے ہیں کہ:

"حضور ﷺ نے خیبر کی کل زمین تقسیم نہ کی بلکہ بعض حصہ تقسیم کیا بعض نہیں، صرف الشق اور النطاۃ کو تقسیم کیا اور باقی کو نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارضِ مفتوحہ میں امام کو اختیار ہے، جو مصلحت دیکھے کرے۔"[2]

آگے صاحبِ اصح السیر ابن ہشام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"خیبر کی زمین (اٹھارہ سہام) کو صرف اصحابِ حدیبیہ پر ہی تقسیم کیا ان میں سے جو حاضر غائب تھے سب کو دیا۔ اصحابِ سیر اس کی تصریح فرماتے ہیں کہ اصحابِ حدیبیہ میں سے صرف جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ خیبر نہ آئے تھے لیکن ان کو حصہ دیا گیا۔"[3]

صاحبِ اصح السیر فرماتے ہیں کہ اب اس کی تفصیل میں اختلاف ہے کہ ان اٹھارہ سو سہام کو کیسے تقسیم کیا گیا تھا؟

صاحبِ اصح السیر امام نووی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ گھوڑے کے حصہ میں اختلاف ہے جمہور کہتے ہیں کہ گھوڑے کا دو دو حصہ ہوتا ہے اس لیے پیدل کا ایک حصہ اور سوار کا تین حصہ ہو جاتا ہے، ایک سوار کا اور دو گھوڑے کا، یہی قول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، امام یوسف امام محمد رحمۃ اللہ علیہم اور دوسرے لوگوں کا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سوار کا دو حصہ ہوتا ہے۔ ایک اس کا اور ایک گھوڑے کا اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[4]

۱۔ أبو داؤد، سنن أبو داؤد، كتاب الخراج والفيء والإمارة، باب في حكم أرض خيبر، حدیث:۳۰۱۲، ص:۴/۶۲۶، حدیث صحیح

۲۔ شرح صحیح بخاری لابن بطال، أبو الحسن علی بن خلف بن عبد الملک بن بطال البکری القرطبی، (مکتبہ الرشد، الریاض، السعودیہ، الطبعہ الثانیہ ۱۴۲۳ھ، ۲۰۰۳ء) ص:۵/۲۸۱

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۷۶

۴۔ ایضاً، ص:۲۸۴

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال مجمع بن جاریہ کی روایت سے ہے (مجمع بن جاریہ کی روایت تین امور میں اس کے خلاف ہے۔ اول: یہ کہ گھوڑے کا ایک حصہ ہے دو نہیں۔ دوم: یہ کہ اس میں ہے کہ آدمی پندرہ سو تھے۔ سوم: یہ کہ اس میں ہے کہ گھوڑے تین سو تھے۔ اس حساب سے پندرہ سہام پندرہ سو آدمیوں کا اور تین سہام تین سو گھوڑے کا)۔ [1]

لیکن ابنِ قیم فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مجمع بن حارثہ کا حال معلوم نہیں، دوسرا استدلال یہ ہے کہ عبد اللہ العمری نافع رضی اللہ عنہ سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ فارس کا دو سہم ہے اور رجل کا ایک سہم، ایک عبید اللہ بن عمر نافع رضی اللہ عنہ سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہ فرس کا دو سہم ہے اور فارس کا ایک سہم، اور صحیحین کی روایت میں تصریح ہے کہ فارس کے تین سہام ہیں دو فرس کا اور ایک فارس کا۔ [2]

صاحبِ اصح السیر اس سارے اختلاف کو بیان کرنے کے بعد جمہور، امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما وغیرہم کے استدلال کو درست قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

> "صحیح یہ ہے کہ کہ چودہ سو آدمی تھے، چودہ سہام ان کے ہوئے کیوں کہ ایک سہام سو حصے کا تھا اور دو سو گھوڑے تھے ہر گھوڑے کو دو حصہ ملا اس لیے چار سہام گھوڑے کے ہوئے"۔
>
> اب اگر دو سو گھوڑے کے چار سہام نکال دیے جائیں تو چودہ سہام بچتے ہیں، لہٰذا چودہ سو آدمی ہونے چاہییں اور حدیبیہ کی راجح تعداد بھی یہی ہے۔ لیکن اگر پندرہ سو بھی ہوں تو ممکن ہے کہ موالی وغلام ایک سو ہوں، جن کو زمین میں حصہ نہ دیا گیا ہو الغرض حصہ پانے والوں کی تعداد چودہ سو ہی تھی۔" [3]

اس مسئلہ میں صاحبِ اصح السیر جمہور اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مؤقف کی تائید کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس حوالے ان کے دلائل زیادہ قوی لگتے ہیں۔ اس پر صحیحین کی روایات بھی ان حضرات کے موقف کی تصریح کرتی ہیں۔ اور یہی پسندیدہ قول ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف اس لحاظ سے بھی تھوڑا کمزور لگتا ہے کہ انہوں نے جو ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اپنی موقف کی تائید میں روایت کی ہے، جبکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی کی روایت دوسرے طرق سے اپنے ہی روایت کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

عمرۃ القضاء:

عمرۃ القضاء کے واقعات سے اخذ کردہ درج ذیل فقہی مسئلہ بیان کیا جارہا ہے۔

۱۔ اَبو داوَد، سنن ابو داوَد، کتاب الجهاد، بَابٌ فِيمَنْ أَسْهَمَ لَهُ سَهْمًا، حدیث:۲۷۳۶

۲۔ ابن قیم، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، ص:۴۴۴

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۲۸۶

۱۲۔ نکاحِ محرم:

صاحبِ اصح السیر عمرۃ القضاء کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے حالتِ احرام میں نکاح کے جائز یا ناجائز ہونے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ ام الفضل کی بہن، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں۔(۱)

صاحبِ اصح السیر کہتے ہیں کہ مؤطامیں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، اہلِ مدینہ کہتے ہیں کہ محرم اگر نکاح کرے تو باطل ہے، لیکن اہل عراق اور اہلِ مکہ کہتے ہیں کہ نکاح جائز ہے۔ جو لوگ منع کرتے ہیں ان میں سعید بن مسیب، قاسم، سلمان بن یسار، لیث، امام وازاعی، امام مالک، امام احمد اور اسحٰق رحمۃ اللہ علیہم ہیں، یہی حضرت عمر، ابن عمر، حضرت علی اور حضرت ابان رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے۔

اور جو لوگ جائز کہتے ہیں ان میں ابراھیم نخعی، سفیان ثوری، عطاء بن رباح، حکم بن عتبہ، حماد بن ابی سلیمان، عکرمہ، مسروق اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے اصحاب، اور یہی حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔(۲)

صاحبِ اصح السیر کہتے ہیں اس بات میں اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء میں ہی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ مگر اختلاف اس بات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکاح کس وقت کیا؟ حالتِ احرام میں یا قبل یا بعد؟(۳)

صاحب اصح السیر ابن قیم کے حوالے اس اختلاف کو تین اقوال میں بیان کرتے ہیں کہ:

پہلا قول: تو یہ ہے کہ عمرہ سے فارغ ہو کر احرام ختم کرنے کے بعد نکاح کیا، یہ قول خود حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا ہے، ابورافع رضی اللہ عنہ بھی یہی کہتے ہیں جو اس معاملہ میں سفیر تھے۔ یہی قول سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور اہلِ نقل کا ہے۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ احرام کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا۔ یہ قول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور اہلِ کوفہ، اور ایک جماعت کا ہے۔

تیسرا قول: درحقیقت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کی تاویل ہے، یعنی جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا تو محرم تھے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ احرام میں تھے۔ بلکہ جو شخص بھی شہر حرام یا بلد

۱۔ ایضاً، ص:۳۰۰

۲۔ لکھنوی، عبد الحیٔ، امام الھمام ابیٔ الحسنات محمد عبد الحیٔ اللکنوی، المؤطا لامام محمد مع تعلیق لمجد مؤطا محمد، (مکتبہ، المیزان ناشران و تاجران کتب، لاہور) ص:۱/ ۲۱۳

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۰۱

الحرام میں ہو اس کو بھی محرم کہتے ہیں۔ اور چونکہ عقد شہر حرام میں ہوا، اس لیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محرم کہا۔[1]

صاحب اصح السیر مانعین کی دلیل ذکر کرتے ہیں کہ سعید بن ابو ہلال نے مجھے نبیہ بن وہب سے حدیث بیان کی کہ عمر بن عبید اللہ بن معمر نے ارادہ کیا کہ حج میں اپنے بیٹے طلحہ کا نکاح شیبہ بن جبیر کی بیٹی سے کریں، ابان بن عثمان ان دنوں حج کے امیر تھے۔ تو انہوں نے ابان کی طرف پیغام بھیجا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ طلحہ بن عمر کا نکاح کر دوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں تو ابان نے انہیں جواب دیا: کیا مجھے تم ایک اکھڑ عراقی جیسے دکھائی نہیں دے رہے! بلاشبہ میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لاَ يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ))[2]

ترجمہ: "محرم کسی کا نکاح نہ کرائے۔"

صاحب اصح السیر کہتے ہیں کہ مانعین کی دلیل میں یہ بات واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محرم نہ خود اپنا نکاح کرے نہ کسی دوسرے کا نکاح کرائے۔[3]

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے خلاف سب سے بڑا استدلال یہی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ابنِ قیم کہتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت اس کے معارض ہے، تاہم یہ قول ہے اور قول کو فعل پر عند التعارض ترجیح دینا واجب ہے۔[4]

امام طحاوی کہتے ہیں کہ ان بیانات سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آثار کی قوت وضعف کے اعتبار سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول (یعنی جواز کا قول) راجح ہے۔ اسی طرح قیاس اور نظر کے اعتبار سے بھی یہی راجح ہے کہ محرم کو وطی منع ہونے کی وجہ سے نکاح کا امتناع ضروری نہیں، جیسا کہ محرم کو لونڈی خریدنا جائز ہے مگر وطی منع ہے، خوشبو خریدنا جائز ہے مگر استعمال منع، سلا ہوا کپڑا خریدنا جائز ہے مگر پہننا منع، ٹھیک اسی طرح احرام کی حالت میں وطی ممنوع ہے اور نکاح جائز۔ واللہ اعلم[5]

صاحب اصح السیر مکمل اختلاف ذکر کرنے کے بعد آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

۱۔ ابن قیم، زاد المعاد، فصل نکاح المحرم فی الحج والعمرۃ، ص: ۳/ ۸۱۷

۲۔ بخاری، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تَحْرِيمِ نِكَاحِ الْمُحْرِمِ وَكَرَاهَةِ خِطْبَتِهِ، حدیث: ۳۵۱۶

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۰۱۔۳۰۲

۴۔ ایضاً

۵۔ طحاوی، ابو جعفر أحمد بن محمد، شرح معانی الآثار، باب نکاح المحرم، (مکتبہ، عالم الکتب، طبعہ أولی، ۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۴ء) ص: ۲/ ۲۶۸

"الغرض دونوں جانب روایت صحیحہ موجود ہیں، وہاں اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سنداً راجح ہے، لیکن خود ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ جب اختلاف دائر ہو منع اور جواز میں تو حکم منع پر ہو گا، کیونکہ اسی میں احتیاط ہے۔"[۱]

اس ساری بحث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ دونوں جانب احادیث صحیحہ موجود ہیں جیسا کہ صاحبِ اصح السیر نے کہا مگر کیونکہ سنداً حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت راجح ہے اس لیے ترجیح جواز کو ہونی چاہیے۔

۱۳۔ غزوۂ طائف کے مالِ غنیمت کی تقسیم میں ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

غزوۂ طائف کے مالِ غنیمت کی تقسیم میں شبہ یہ ہے کہ جو حصّہ مؤلفۃ القلوب کے لیے خرچ کیا گیا وہ خمس کے علاوہ مال میں سے تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل پر تو اعترض کرنا محال ہے لیکن بحث یہ ہے کہ کیا یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا یا امام وقت کے لیے بھی جائز ہے کہ ضرورت کے پیش نظر خمس کے علاوہ مال کو مصلحتِ عامہ کے لیے خرچ کرے یا نہیں؟۔[۲]

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ کسی روایت میں تشریح نہیں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب کو جو اموال جعرانہ میں عطا فرمائے وہ مجموعہ غنائم میں سے تھا یا خمس میں سے، علماء کی رائے اس میں مختلف ہے۔[۳]

امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ خمس میں سے بلکہ خمس الخمس میں سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص تھا، اور بہ ظاہر یہی قول قوی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو عطاء کرنے کے وقت غانمین سے اجازت نہیں لی، اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ نہ تھا کہ اموالِ صحابہ یا ان کے حقوق کو بغیر کسی کی اجازت کے دیں۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے تھی کہ ہوازن کے سبایا کو واپس کر دیا جائے، مگر یہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے صرف سفارش کی نہ خود ان کے حصہ کو واپس کیا نہ ان کو حکم دیا کہ واپس کر دو۔ سفارش کے بعد بھی جن لوگوں نے واپس کرنے سے انکار کیا ان کو بدلہ دینے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ کیا۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال پر تو صرف وہی شخص ہی اعتراض کر سکتا ہے جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف نہیں۔[۴]

صاحب اصح السیر اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۰۳

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۳۶۵

۳۔ ایضاً، ص:۳۶۶

۴۔ ایضاً، ص:۳۶۷

"خمس میں تو بلکل ظاہر ہے اس کو تو بلا تامل مصالحِ عامہ پر صرف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر غیر خمس میں بھی اگر ضرورت شدید داعی ہو تو اس کو بھی کیا جاسکتا ہے۔ مصالح عامہ اسلامی بہر حال فوائدِ شخصیہ پر مقدم ہیں اور عدل کے خلاف نہیں بلکہ عین عدل ہے، لیکن تقسیم سے قبل یا اموال کو دارالسلام میں لانے سے پہلے تقسیم کے بعد نہیں۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال خمس کے علاوہ تھا۔ اس لیے اس میں کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں۔ رہی دوسری بات کہ مال خمس کی تو اس کے متعلق صاحب اصح السیر نے بہت زبردست اصول بیان کیا ہے کہ امیرِ اسلام کو اجازت ہے کہ اگر ضرورتِ شدید ہو تو خمس مال کو بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ مصالحہ عامہ اسلامی فوائدِ شخصیہ پر مقدم ہیں۔

غزوۂ تبوک:

غزوۂ تبوک کے واقعات سے اخذ کردہ مندرجہ ذیل فقہی مسائل کو ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۴۔ نفیرِ عام کا حکم:

صاحب اصح السیر غزوۂ تبوک کے قصہ سے ایک یہ فقہی نکتہ بیان کرتے ہیں کہ:

"غزوۂ تبوک کا قصہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ جب امام کی طرف سے جہاد کے لیے نفیرِ عام ہو جائے تو کسی شخص کو رکنا جائز نہیں ہے، جب تک امام سے اجازت نہ حاصل کرلے۔"[2]

دوسرا فقہی نکتہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نفیرِ عام کے بعد جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے، گو فرداً فرداً اس کی خبر نہ دی گئی ہو۔"[3]

۱۵۔ قصرِ صلوٰۃ:

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ تبوک میں آپ ﷺ نے نمازِ قصر ادا فرمائی، حالانکہ علی الصحیح اٹھارہ بیس روز ان مقامات میں قیام کرنا پڑا، یہ دلیل ہے کہ:

"مسافر جب تک اقامت کی نیّت نہ کرلے قصر کرتا رہے۔"[4]

۱۔ ایضاً

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۰۸

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۱۶۔ قضا علی الظاہر:

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے والوں میں سے منافقین نے آپ ﷺ کے سامنے عذر پیش کیا تو وہ اس عذر کرنے کی وجہ سے چھوڑ دیے گئے، حالانکہ ان کا نفاق آپ ﷺ کو معلوم تھا۔ لیکن مخلصین جنہوں نے کوئی عذرِ شرعی پیش نہ کیا ان کو تنبیہ کی گئی، حالانکہ ان کا مخلص و مؤمن ہونا سب کو معلوم تھا۔[۱]

صاحب اصح السیر اس واقعہ سے یہ فقہی نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"تبوک کے متخلفین کا قصہ دال ہے کہ قضا ظاہر پر ہوتا ہے۔"[۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کر دے اللہ تعالیٰ اس اس کو تھوڑی سی سرزنش کے بعد معاف فرما دیتے ہیں۔

۱۷۔ صدقہ علی البشارہ:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ٹھیک پچاسویں دن میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا، کہ اس حال میں میں نے آواز سنی کہ جبلِ سلع سے کوئی شخص بلند آواز سے پکار رہا تھا کہ اے کعب بن مالک! بشارت ہو، میں سجدہ میں گر گیا اور سمجھ گیا کہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے میری توبہ کی قبولیت ہوئی۔ جب بشارت دینے والا میرے پاس پہنچا تو میرے بدن پر دو کپڑے تھے، میں نے وہ دونوں اتار کر اس کو دے دیے، اور خدا کی قسم! میرے پاس اس کے سوا اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ میں نے دوسرا کپڑا اس سے عاریۃً لے کر پہنا۔[۳]

صاحب اصح السیر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ کی قبولیت کے اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"بشارت کے وقت بقدرِ استطاعت صدقہ مستحب ہے۔"[۴]

اس سے معلوم ہوا کہ بوقت بشارت یعنی خوشخبری دینے والے پر بقدرِ استطاعت صدقہ مستحب ہے اور مستحسن عمل بھی ہے۔

۱۸۔ ہدایا و تحائف:

۱۔ ایضاً

۲۔ ایضاً

۳۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۰۹

۴۔ ایضاً

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھانے کی چیزیں، سواری کے جانور یا دوسری ضرورت کی چیزیں ہدیہ کرتے تھے اور حضور ﷺ اس کو قبول فرماتے تھے اور کبھی ایسی ہی یا اس سے زیادہ قیمت کی چیز اس کے بدلے میں انہیں بھی ہدیہ میں دیتے تھے۔ اسی طرح سلاطین نے آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجے آپ ﷺ نے قبول فرمائے۔ اور سلاطین کے ہدیہ کو اپنے اصحاب میں تقسیم فرماتے تھے اور جو چیز آپ ﷺ کو پسند ہوتی وہ اپنے لیے رکھتے جیسے مقوقس حاکم اسکندریہ نے آپ کو ہدیہ بھیجا، اس میں ماریہ قبطیہ اور سیرین تھیں۔ اس کے علاوہ ایک گدھا، ایک خچر اور کچھ چیزیں تھیں۔ آپ ﷺ نے حضرت ماریہ کو خود پسند فرمایا اور سیرین کو حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو بخش دیا۔[۱]

آگے صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کے ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو ہدیہ بھیجا تو آپ ﷺ نے اس کے ہدیہ کو قبول فرمایا، لیکن عامر بن مالک ملاعت الاسنہ نے آپ ﷺ کے لیے ایک گھوڑا ہدیہ بھیجا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہم مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح عیاض مجاشعی نے آپ ﷺ کو ہدیہ دینا چاہا مگر آپ ﷺ نے قبول نہ کیا۔[۲]

صاحب اصح السیر اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"ابو سفیان کا ہدیہ آپ نے قبول فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہدنہ کا زمانہ تھا اور اس وقت قریش کے ساتھ آپ ﷺ کی جنگ موقوف تھی۔ مقوقس کا ہدیہ بھی آپ ﷺ نے اس لیے قبول کیا کہ اس نے آپ کے سفیر حاطب بن ابی بلتعہ کی عزت کی تھی اور آپ کے نبی ہونے کا اقرار کیا تھا، آپ کو اس کے اسلام سے مایوسی نہیں ہوئی تھی لیکن کسی مشرک محارب کا ہدیہ آپ نے کبھی قبول نہیں کیا۔"[۳]

اس بحث سے معلوم ہوتا ہے آپس میں ایک دوسرے کا ہدیہ قبول کرنا مستحسن عمل ہے کیونکہ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ مشرک محارب کے علاوہ کفار سے بھی ہدیہ قبول کرلینا جائز ہے بشرطیکہ وہ حالت امن میں ہوں۔ لیکن امام المسلمین کے ہدیہ کا حکم یہ ہے کہ وہ بیت المال میں شمار ہوگا اور اسی طرح امیر لشکر کو کفار جو ہدیہ دیں وہ بھی مال غنیمت میں شمار ہوگا۔

خلاصہ بحث

اس فصل میں اٹھارہ مسائل بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے فصل کے شروع میں سرایا سے اخذ کردہ مسائل جیسے قنوت نازلہ قنوت الفجر وغیرہ۔ اور اسی طرح غزوہ خیبر سے اخذ کردہ مسائل جیسے ممنوعات خیبر وغیرہ، غزوۂ بنی المصطلق

۱۔ ایضاً، ص:۴۴۲

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۴۴۳

۳۔ ایضاً

سے اخذ کردہ مسئلہ تیمم، غزوۂ تبوک سے اخذ کردہ مسائل جیسے قصر صلاۃ، قضا علی الظاہر اور اس کے علاوہ مسائل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے جن جن مسائل میں فقہاء کا اختلاف ہے اس اختلاف کو بھی حسب ضرورت دلیل کی روشنی میں آسان انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم

غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد اور عصرِ حاضر میں ان سے استفادہ

فصل اول: غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد

فصل دوم: عصرِ حاضر میں ان جنگی اصول و قواعد سے استفادہ کی صورتیں

فصل اوّل

غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد

رسول اللہ ﷺ نے غزوات و سرایا میں ایسے ایسے جنگی اصول وضع کیے جن سے اہل اسلام یقینی طور جنگ جیت لیتے تھے۔ اور بعض اوقات تو بغیر کسی جانی نقصان کے بھی جنگ جیت جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ کی مدنی زندگی سے شروع ہونے والی پے درپے جنگی مہمات کے باوجود مسلمانوں کا جانی نقصان بہت کم ہوا۔ اور یہ سب آپ ﷺ کی اعلیٰ جنگی حکمتِ عملی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ذیل میں آپ ﷺ کی جنگی حکمت عملی سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد کو ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ استقلال و ثابت قدمی:

غزوات میں حضور اکرم ﷺ کی شجاعت اور بہادری کی طرح آپ ﷺ کی استقامت واستقلال بھی بے مثال ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں افرادی قوت کی کمی ہو، زاد راہ کم ہو، آلات حرب کی کمی ہو خوشی ہو یا غم آپ ﷺ کے استقلال واستقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں آتی تھی۔ حتّٰی کہ کئی مواقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے تو آپ ﷺ نے ان کو حوصلہ دیا اور خود جبل استقامت بنے رہے۔

پھر اگر کسی موقع پر اہل اسلام کی جانب سے کچھ کم ہمتی کا مظاہرہ ہوا تو اس پر اللہ تعالی نے سابقہ امم اور انبیاء سابقین کی ثابت قدمی کو بیان کر کے اہلِ اسلام اور نبیٔ کریم ﷺ کو تسلی اور حوصلہ دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوالِمَاأَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (۱)

ترجمہ: "اور کتنے سارے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی! نتیجتاً انہیں اللہ کے راستے میں جو تکلیفیں پہنچیں ان کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری نہ وہ کمزور پڑے اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو جھکایا اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے۔"

آیت مذکورہ میں سابق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جہاد میں شریک اللہ والوں کی جنگ میں ثابت قدمی اور مصائب سے نہ گھبرانا نہ کمزور ہونا بیان فرمانے کے بعد ان کی ایک اور عظیم الشان صفت کا بیان بھی اس طرح فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اس بے مثال قربانی کے ساتھ بھی اللہ تعالی کی بارگاہ میں چند دعائیں کرتے رہتے تھے۔

ا۔ آل عمران:۱/۱۴۶

اول یہ کہ ہمارے پچھلے گناہ معاف فرمادے۔ دوسرے یہ کہ حالیہ عمل جہاد میں ہم سے جو کوتاہی ہو گئی ہو اس کو معاف فرمادے۔ تیسرے یہ کہ ہمیں ثابت قدمی پر قائم رکھے۔ چوتھا یہ کہ ہمیں دشمنوں پر غالب کر دے۔ (۱)

جیسا کہ صاحب اصح السیر غزوۂ حنین میں آپ ﷺ کی استقامت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں پر اچانک دونوں طرف سے حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی تو مسلمان بوکھلاہٹ میں منتشر ہو کر بھاگنے لگے، مگر نبیٔ کریم ﷺ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت آپ ﷺ کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر اللہ کا رسول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمارہا بلکہ حضور ﷺ نے اپنے خچر کو کفار کی جانب بھگانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے کفار پر رعب طاری ہوگیا اور مسلمانوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو واپس پلٹے اور کفار کو شکست دی۔ (۲)

اور آیت کی تفسیر سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ مومن کا کام یہ ہے کہ وہ کتنا ہی بڑا نیک کام اور کتنی ہی جد و جہد اللہ کی راہ میں کر رہا ہوں اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے عمل پر ناز و فخر کرے کیوں کہ در حقیقت اس کا عمل بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ جو نیک عمل وہ اس وقت تک کر رہا ہے آگے بھی اسے اس کی توفیق ہوگی یا نہیں اس لیے موجودہ عمل میں کوتاہی پر ندامت اور آئندہ کے لئے اس پر قائم رہنے کی دعا لازمی کرنی چاہیے مذکورہ دعاؤں میں سب سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں انسان کو جو رنج و غم یا کوئی تکلیف یا دشمن کے مقابلہ میں شکست پیش آتی ہے وہ اس کے سابقہ گناہوں کا اثر ہوتا ہے جس کا علاج استغفار و توبہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے تمام غزوات میں ہمیں استقلال و ثابت قدمی کا درس دیا ہے بلکہ بعض مقامات پر حضور ﷺ نے ثابت قدمی کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا کہ وہ آپ ﷺ کی شان کریمی کے ہی لائق تھا اور در حقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ انسانی ہمت اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

۲۔ اتفاق و اتحاد اور اطاعت امیر:

غزوات و سرایا سے حاصل کردہ جنگی اصولوں میں نمایاں ایک اصول یہ بھی ہے کہ امیر کی اطاعت کی جائے اور دوران جنگ آپس کے ہر قسم کے اختلاف سے پرہیز کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں غزوات میں اپنے محبوب ﷺ کی غیبی مدد کا انتظام فرمایا وہیں اگر کسی قسم کا آپس کا اختلاف یا اطاعت امیر میں کسی قسم کی کوتاہی ہوئی تو اس پر قولاً اور عملاً تنبیہ فرمائی۔ اور قرآن مجید نے بھی واضح طور پر اس اصول کی طرف رہنمائی فرمائی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

۱۔ مظہری، علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، التفسیر المظہری، (بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ) ۲-۱ / ۱۵۲

۲۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۵۲

﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا﴾[1]

ترجمہ: "اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو۔"

آیت مذکورہ میں اس چیز کی تلقین کی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑو! کیونکہ اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت اس کی اطاعت ہی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے معصیت اور نافرمانی تو اللہ کی ناراضگی اور ہر فضل سے محرومی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس آیت میں مضر پہلوؤں پر تنبیہ کر کے اس سے بچنے کی ہدایت ہے اور وہ مضر پہلو جو جنگ کی کامیابی میں مانع ہوتے ہیں باہمی نزاع و اختلاف ہے اس لئے فرمایا آپس میں نزاع اور جھگڑا نہ کرو ورنہ تم میں بزدلی پھیل جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔[2]

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی حضور ﷺ نے جابجا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو امیر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

((مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ خَالَفَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ، فَمِيتَتُهُ جَاهِلِيَّةٌ))[3]

ترجمہ: "جو آدمی اپنے امیر کی طرف سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے اچھی نہ لگے تو وہ صبر کرے، کیونکہ جس نے مسلمانوں کی جماعت کی ایک بالشت بھر بھی مخالفت کی اور اسی حال میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔"

اسی طرح غزوۂ احد کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ غزوۂ احد میں رسول ﷺ نے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے پچاس تیر اندازوں کو عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ماتحت فوج کے پیچھے ایسی جگہ پر مقرر کر دیا جہاں سے اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں پشت کی جانب سے حملہ نہ کر دے۔ اور ان سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ:

"جہاں تمہیں مقرر کیا گیا ہے وہیں ڈٹے رہو اور ہماری پشت کی حفاظت کرو۔ اگر تم دیکھو کہ ہمیں فتح حاصل ہو گئی ہے تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا اور اگر دیکھو کہ ہمیں شکست ہو رہی ہے اور ہمیں قتل کیا جا رہا ہے تو بھی ہماری مدد کے لیے یہاں سے نہ ہٹنا۔"[4]

لیکن پھر غلطی یہ ہوئی کہ جب تیر انداز مسلمانوں نے کفار کی شکست دیکھی تو وہ الغنیمہ الغنیمہ کرتے ہوئے

۱۔ الانفال: ۸/ ۴۶

۲۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل القرآن (بیروت لبنان)، ۶، جز ۹-۱۰، /۱۵-۱۶

۳۔ مسند امام احمد بن حنبل، مُسْنَدُ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْعَبَّاسِ، حدیث: ۲۴۸۷، (حدیث صحیح)

۴۔ ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، ص: ۳/ ۸۰

میدان میں چلے آئے اور اس جگہ کو چھوڑ دیاجہاں ان کو نبیٔ کریم ﷺ نے مقرر فرمایاتھا حالانکہ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ ان کو روکتے رہے۔ قریش کے سواروں نے جب اس جگہ کو خالی پایاتو مسلمانوں کی پشت کی جانب سے آگئے اور مسلمانوں کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اس اچانک صورتِ حال سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور ستّر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ بھی کفار میں گھر گئے اور آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوگیا۔ مسلمانوں کو مشرکین کی طرف سے بہت جانی نقصان پہنچااوراس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اس غزوۂ میں ایک بھاری شکست کا سامنا کرناپڑا۔ اور یہ سب اطاعت امیر میں کوتاہی کے سبب ہوا۔[1]

صاحب اصح السیر نے اس اصول کو جہاد کا بنیادی اصول قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بے سرو سامانی کے باوجود فارس اور روم پر جو فتح نصیب ہوئی وہ اسی اطاعت کی برکت تھی اور جنگ احد میں جو مسلمانوں نے آپس میں جھگڑا کیااور آپ ﷺ کے حکم سے غفلت کی تو اس کی وجہ سے ان میں بزدلی آگئی اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور دشمنوں پر جو ان کا رعب تھاوہ جاتارہا۔ اوراسی وجہ سے مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرناپڑا۔

اس آیت و حدیث میں واضح طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ کفار پر رعب قائم رکھنے کے لیے اور کامیابی کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ من وعن امیر کی اطاعت کی جائے اور آپس کے اختلاف سے اجتناب کیاجائے اور مشکل وقت میں صبر کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھاجائے۔

۳۔ کثرتِ تعداد کی بجائے نصرت باری تعالیٰ پر اعتماد:

رسول اللہ ﷺ نے جنگ کی تربیت کے جو سنہری اصول اس امت کو عطاکیے ہیں ان میں ایک اہم اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ مسلمان کو کسی بھی موقع پر کثرت تعداداور اسباب وآلات پر بھروسہ نہیں کرناچاہیے۔ کیونکہ فتح وکامرانی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ﴾[2]

ترجمہ: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمھیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جبکہ تمھیں اپنی کثرت پر ناز ہوگیا تھا لیکن اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے۔"

آیت مذکورہ میں غزوہ حنین کے ابتدائی مرحلہ میں جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص:۱۸۵

۲۔ التوبہ:۹/۲۵

کے دلوں پر اپنی تسلی نازل فرما دی۔ جس سے ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور بھاگنے والے واپس لوٹ آئے اور حضور نبی کریم ﷺ پر اور ان صحابہ پر جو مضبوطی کے ساتھ محاز پر جمے رہے ان پر تسلی نازل فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی فتح قریب نظر آنے لگی۔[1]

اس آیت کا پس منظر جس کو صاحب اصح السیر نے بھی ذکر کیا وہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ کفار ہوازن اور ثقیف و حنین کے مقام پر جنگ کے ارادہ سے جمع ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ بارہ ہزار کا لشکر جرار لے کر ان کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے، جبکہ کفار کے لشکر کی تعداد چار ہزار تھی اس وقت بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ لفظ نکلا کہ آج ہم قلت کی وجہ سے مغلوب نہ ہوں گے۔ یہ لفظ اللہ تعالی کو پسند نہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ مگر پھر مسلمان اپنی لغزش پر متنبہ ہوئے جس پر اللہ تعالی نے تائید غیبی کی مدد سے انہیں فتح و نصرت نصیب فرمائی۔ جیسا کہ صاحب اصح السیر غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح کامیابی سے نوازا۔ اور اسی طرح غزوۂ حنین میں بھی اللہ تعالیٰ نے کثرت تعداد کے باوجود مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال دیا۔ تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نہ تو مسلمانوں کو کثرت تعداد پر بھروسہ کرنا چاہیے اور نہ ہی تعداد کے کم ہونے کی وجہ سے گھبرانا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کثرت تعداد اور اس قسم کے دیگر اسباب پر نظر نہیں رکھنی چاہیے بلکہ نظر تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے اور اسباب کو محض حکم باری تعالیٰ سمجھ کر اختیار کرنا چاہیے۔

۴۔ دوران قتال فخر و تکبر کی ممانعت:

صاحب اصح السیر فرماتے ہیں کہ دوران جنگ فتح و کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان فخر و مباہات سے جتنا ہو سکے اجتناب کریں۔ غرور و تکبر سے کوسوں دور رہیں اور تواضع اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾[2]

ترجمہ: "اور ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں میں خود نمائی کرتے ہوئے اپنے گھروں سے چلے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے گھیر لینے والا ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اشارہ قریش مکہ کے حالات کی طرف بھی ہے جو

۱۔ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل ابن کثیر القرشی، تفسیر القرآن العظیم (مکتبہ حقانیہ پشاور)، ص:۲ / ۱۳۲-۱۳۴

۲۔ الانفال:۸ / ۴۷

اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے بھاری تعداد اور سامان لے کر اپنی قوت و کثرت پر اتراتے ہوئے نکلے تھے۔ اور جب تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے باہر ہو گیا تو اس وقت بھی اس لئے واپس نہیں ہوئے کے اپنی شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ کیونکہ ابو سفیان جب اپنا تجارتی قافلہ لے کر مسلمانوں کی سے بچ نکلا تو ابو جہل کے پاس قاصد بھیجا کہ اب تمہارے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں رہی واپس آ جاؤ اور بہت سے قریش کے بڑے سرداروں کی بھی یہی رائے تھی مگر ابو جہل اپنے تکبر و غرور اور شہرت پرستی کے جذبہ میں قسم کھا بیٹھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک چند روز مقام بدر پر پہنچ کر اپنی فتح کا جشن نہ منالیں گے۔ (۱)

اس آیت میں ایک اور مضر پہلو پر تنبیہ اور اس سے پرہیز کی ہدایت دی گئی ہے کہ اپنی قوت پر ناز یا کام میں اخلاص کی بجائے اپنی کوئی اور غرض نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی بڑی بڑی طاقتور جماعتوں کو پسپا کر دیا کرتی ہیں۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو مشرکین و دشمنان اسلام کی مشابہت اختیار نہ کرنے کا حکم دیا ہے کہ جس طرح کفار اپنے گھروں سے غرور و تکبر کے ساتھ نکلے تھے۔ تم اس طرح کی خرافات سے اجتناب کرو کیوں کہ نمود و نمائش، ریاکاری اور شہرت و ناموری وغیرہ سب ایسی چیزیں ہیں جو شکست کا باعث بنتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے انسان امداد غیبی جیسی برکات سے محروم ہو جاتا ہے۔ افواجِ کفار کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ قحبہ خانوں اور شراب نوشی کے بغیر جنگ نہیں کرتے تھے۔ اور اس کی بنیادی وجہ در حقیقت دونوں جماعتوں کے مقاصد کا اختلاف ہے۔ کفار کے ہاں دنیا ہی اصل ہے اس لئے ان کے ہاں اس کا حصول جس طرح سے بھی ہو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ جبکہ مجاہدینِ اسلام کے پیش نظر اعلاء کلمۃ اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے نہ کہ قتل و غارت گری۔

۵۔ دوران جنگ صف بستہ وصف آراء ہونا:

صاحب اصح السیر غزوات و سرایا سے ایک جنگی اصول یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ مجاہدین اسلام کو دوران جنگ صف بستہ ہو صف آرا ہو کر لڑنا چاہیے اور بوقتِ جہاد اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ وہ اس عمل کے ذریعے سے اللہ تعالی کے محبوب ترین افراد بن جائیں گے لہذا جس قدر عظیم الشان کام ہے اس کی ذمہ داریاں بھی اسی قدر ہیں۔ اور دوران قتال ان کے نظم و ضبط کا اہتمام انتہائی ضروری ہے۔

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ مجاہدینِ اسلام کو اس کا حکم دیتے ہیں چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ﴾ (۲)

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲/ ۱۱۱-۱۱۲

۲۔ الصف: ۶۱/ ۴

ترجمہ: "بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ جہاد کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔"

اس آیت کی تفسیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ احب الاعمال جس کی تلاش میں یہ حضرات تھے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور ساتھ ہی ان حضرات نے جو ایسے کلمات کہے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے تو ہم اس پر عمل کرنے میں ایسی ایسی جانبازی دکھائیں گے وغیرہ۔ جن میں ایک قسم کا دعوی ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں اس پر ان حضرات کو تنبیہ کی گئی کہ کسی مومن کے لیے ایسے دعوے کرنا درست نہیں اسے کیا معلوم کہ وہ وقت آنے پر اپنے ارادے کو پورا کر سکے گا بھی یا نہیں ۔اس کے اسباب کا جمع ہونا اور موانع کا زائل ہونا اس کے اختیار میں نہیں پھر خود اس کے دست و بازو اور اعضاء و جوارح بلکہ قلبی عزم و ارادہ میں سے کوئی چیز بھی اس کے قبضے میں نہیں اسی لئے خود رسول اللہ ﷺ کو بھی قرآن کریم میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ جو کام آپ کو آئندہ کرنا ہو اگر اس کو بیان کرنا ہے تو انشاء اللہ کی قید کے ساتھ بیان کرو کہ اللہ نے چاہا تو میں فلاں کام کروں گا۔ (1)

اس آیت میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں جو قانون بیان ہوا ہے اس پر عمل کرنے سے اہلِ اسلام کو ہی فائدہ ہو گا، کیونکہ جب مجاہدینِ اسلام ڈٹ کر دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں تو پھر جہاں آخرت بنتی ہے وہیں اللہ تعالیٰ اس عظیم عمل کی برکت سے ان کے دنیوی معاملات اور ان کے معاشی حالات میں بھی آسانی پیدا فرما دیتے ہیں۔

۶۔ شرکاء لشکر کی صلاحیتوں کی معرفت:

حضور نبیٔ کریم ﷺ اپنے رفقائے لشکر کی صلاحیتوں کی پوری طرح خیال رکھتے تھے۔ ان کی خوبیوں اور کمالات سے آپ ﷺ خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے آپ ﷺ ہر آدمی کو اسی کام پر متعین فرماتے جس میں اس کام کو انجام دینے کی پوری صلاحیت موجود ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتخاب فرماتے اپنے اہداف کو وہ آسانی سے انجام دیتے تھے۔

جیسا کہ صاحب اصح السیر غزوۂ احد کے ضمن میں ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کے رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد کے دن ایک تلوار لے کر فرمایا کہ مجھ سے یہ تلوار کون لے گا۔ صحابہ کرام میں سے ہر ایک نے اپنے ہاتھوں کو دراز کر کے کہا کہ میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے اس کا حق ادا کرنے کی شرط پر کون لے گا۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت سماک بن خرشہ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اسے اس کا حق ادا کرنے کی شرط پر لیتا ہوں۔ پس اللہ کے رسول ﷺ نے تلوار ان کو دے دی۔ اور انہوں نے اس کے ساتھ کفار کی خوب کھوپڑیاں پھوڑیں۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اس تلوار سے نہایت شدید لڑائی کی اور جب مسلمان محاصرہ میں آ گئے تو ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اپنے جسم کو رسول اللہ ﷺ کے لئے ڈھال بنا

۱۔ طبری، جامع البیان عن تاویل القرآن، ۱۴، جز،۲۸-۲۹/۸۶

لیا اور اپنی پیٹھ حضور اکرم ﷺ پر جھکا دی، اور تیر ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی پیٹھ پر برستے رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سپہ سالار کو ہر فوجی کی صلاحیتوں کا ادراک کر کے اس کے مطابق اس کو خدمت دی جائے۔ تاکہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق خدمت کا پورا حق ادا کر سکے جیسا کہ آپ ﷺ نے جو ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں کا ادراک کر کے انہیں تلوار دی تھی۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اس کا خوب حق ادا کیا۔ اور حضور ﷺ کا اس انداز سے دفاع کیا جو قابل رشک ہے۔

۷۔ دشمن کے بارے میں معلومات کا حصول:

جنگ کے دوران دشمن کے بارے میں پوری خبر رکھنا انتہائی اہم ہوتا ہے اور جنگ کی منصوبہ بندی کا دارومدار ہی دشمن کے بارے میں ملی ہوئی معلومات پر ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ اس کا خوب اہتمام فرماتے اور مختلف ذرائع سے دشمن کی طاقت و قوت اور ان کی تیاری کی خبر رکھتے۔

جیسا کی واقعات غزوۂ بدر میں صاحب اصح السیر ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ جب مقام بدر کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ نے چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بدر کی طرف بھیجا کہ خبر لائیں، ان لوگوں نے قلیب بدر پر قریش کے دو غلاموں کو پکڑ لیا۔ اس وقت حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر حضور ﷺ نے غلاموں سے دریافت کیا کہ قریش کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ عدوۂ قصوی میں یعنی کہ انتہائی کنارہ میں جو بڑا ٹیلا ہے اس کا نام "عقنقل" ہے، اسی کے پیچھے مقیم ہیں آپ نے پوچھا: کتنے ہیں؟ کہا: بہت ہیں۔ پوچھا: تعداد؟ کہا: یہ ہمیں معلوم نہیں۔ پوچھا: روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ کہا: ایک روز نو ایک روز دس۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہزار اور نو سو کے درمیان ہیں۔ [۱]

اسی طرح غزوۂ حنین میں آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن ابی حدرد الاسلمی رضی اللہ عنہ کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا۔ انہوں نے ایک دو روز حالات کی جستجو میں گزارے اور اہم معلومات لے کر آئے حضور ﷺ کو اس سے آگاہ کیا۔

حضور ﷺ مختلف طریقوں سے کفار کی جنگی تدابیر کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ مثلاً:

- اہل الرائے سے مشورہ کے ذریعہ سے۔
- شخصی اطلاعات کے ذریعہ سے۔
- جاسوسوں کے ذریعے سے۔

یعنی کہ مختلف غزوات میں رسول اللہ ﷺ مختلف ذرائع سے دشمن کی معلومات کا حاصل کرنے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۱۶۷

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حکمراں کے لیے جائز ہے کہ جہاد کے لیے یا دوسرے کاموں یعنی امن واستحکام کے قیام کے لیے مخبروں اور جاسوسوں سے مدد لے اور انہیں دشمنوں میں پھیلادے تاکہ مسلمانوں کو ان کے منصوبوں اور حالات کا علم ہوسکے۔ اورواقعہ غزوۂ خندق سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جاسوس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ دشمنانِ اسلام میں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائے اورانہیں ایک دوسرے کے خلاف کردے۔

۸۔ دورانِ قتال اخلاقی قواعد وضوابط:

حضور ﷺ نے غزوات و سرایا میں اخلاقی اقدار اور انسانی تکریم کو ملحوظ رکھتے ہوئے باقاعدہ ضوابط متعارف کروائے۔ مثلاً ظالمانہ طریقوں سے دشمن کو قتل کرنے اور اذیت دینے سے قطعاً منع کیا گیا۔ اسی طرح جنگ میں شریک نہ ہونے والے لوگوں جیسے عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور غلاموں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا۔ جنگی قیدیوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا۔ یہاں تک کہ جانوروں اور فصلوں کو بھی جلانے اور بلاوجہ درخت کاٹنے سے بھی منع کیا گیا۔ مزید یہ کہ ناحق قتل کرنے سے بھی منع کیا گیااور فرمایا گیا کہ تم صرف ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں یا جو جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔

جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ﴾[۱]

ترجمہ: "اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔"

اس آیت میں حکم یہ ہے کہ مسلمان صرف ان کافروں سے قتال کریں جو ان کے مقابلہ پر قتال کے لیے آویں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے، اور اپنے مذہبی شغل میں دنیا سے یکسو ہو کر لگے ہوئے عبادت گزار راہب پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ یا وہ لوگ جو کافروں کے ہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں مگر ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ آیت کا حکم صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں اور مذکورہ قسم کے سب افراد کی قتال کرنے والے نہیں۔ اسی لئے فقہاء نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں یا مسلمانوں کے مقابلے میں کسی طرح سے ان کی مدد کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے کیونکہ وہ اس آیت کے مضمون میں داخل نہیں۔[۲]

دورانِ جنگ ان تمام چیزوں سے منع کرنے سے ہمیں اسلام میں انسانی عظمت و وقار اور انسانی تکریم کا اندازہ

۱۔ البقرۃ:۱/۱۹۰

۲۔ مظہری، التفسیر المظہری، ص:۱-۲/۲۱۲

ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اسلام دفاعی جنگ کی اجازت ضرور دیتا ہے مگر اس میں بھی دشمن کے ساتھ زیادتی یعنی حد سے تجاوز کرنے سے منع کرتا ہے۔

۹۔ دوران قتال صلہ رحمی کا تصور:

صلہ رحمی کو اسلام میں باقاعدہ ضابطہ کی حیثیت حاصل ہے جو نہ صرف ہمیں غزوات نبوی میں نمایاں نظر آتا ہے بلکہ آپ ﷺ کی پوری زندگی صلہ رحمی کی عظیم مثال ہے۔ یعنی کہ آپ ﷺ نے صلہ رحمی کو حقیقی معنویت عطا کی ہے۔

مثلاً صرف غزوۂ حنین میں حضور ﷺ نے چھے ہزار قیدیوں کو بطورِ احسان بلا ہدیہ رہا فرمایا بلکہ رہائی کے وقت تمام قیدیوں کو ایک ایک چادر بھی بطور ہدیہ عطا فرمائی۔[۱]

مزید آپ ﷺ نے فتح مکہ اور دیگر مواقع پر صلہ رحمی کی جو مثالیں قائم کیں وہ تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے غزوات میں بھی تکریم انسانیت کی تعلیم دی۔ اگر آپ دشمن سے لڑ رہے ہوں تب بھی یہ اجازت نہیں کہ آپ دشمن کی تذلیل کریں۔ یعنی کہ آدابِ قتال کو ہر حال میں ملحوظ رکھیں۔

دوران جنگ ممنوع امور

حضور نبیٔ کریم ﷺ نے جس طرح زندگی کے باقی معاملات میں جاہلانہ رسم و رواج اور طور طریقوں کو ختم فرمایا، اسی طرح جنگ کے طور طریقوں میں بھی اصلاحات فرمائیں۔ کیونکہ اسلام میں جہاد کا ایک مقام ہے اور یہی اصلاحات اسلام کے تصور جہاد کو واضح کرتی ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ نے دوران جنگ ایسے تمام امور جن میں وحدت و بربریت کا عنصر تھا ان سے مجاہدین اسلام کو اجتناب کرنے کا حکم فرمایا۔ اسی لئے بے شمار غزوات کے باوجود بھی انسانی جانوں کا نقصان نہ ہونے کے برابر ہے۔

ذیل میں حضور ﷺ کی جانب سے دوران قتال منع کیے جانے والے امور کو بیان کیا جارہا ہے۔

۱۔ جنگ میں شریک نہ ہونے والوں کے قتل کی ممانعت:

حضور اکرم ﷺ نے دوران جہاد ایسے افراد کو قتل کرنے کی ممانعت فرمادی جو بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ میں شریک نہ ہوں۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: نافع رضی اللہ عنہ نے اور انہیں عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ:

((أَنَّ امْرَأَةً وُجِدَتْ فِي بَعْضِ مَغَازِي النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقْتُولَةً فَأَنْكَرَ رَسُولُ اللَّهِ

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۳۴۸

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ))[1]

ترجمہ: "غزوات نبی میں سے ایک غزوہ میں قتل کی ہوئی عورت پائی گئی، پس منع کر دیا رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے سے۔"

اس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ کسی بھی طور پر جنگ میں شریک نہ ہوں ان کو قتل کرنے سے منع کیا گیا تھا تا کہ یہ بات معلوم ہو کہ جہاد میں قتل و غارت گری مقصود نہیں ہے۔

۲۔ آگ میں جلانے کی ممانعت:

زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ فتح کے نشے میں آکر مغلوب اقوام کو انتقام کی وجہ سے آگ میں زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے اہل اسلام کو اس وحشیانہ حرکات سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

حضرت حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایک دستہ کا امیر مقرر فرما دیا اور وہ کہتے ہیں جب میں نکلنے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنْ وَجَدْتُمْ فُلَانًا فَأَحْرِقُوهُ بِالنَّارِ، فَوَلَّيْتُ فَنَادَانِي فَرَجَعْتُ إِلَيْهِ فَقَالَ: إِنْ وَجَدْتُمْ فُلَانًا فَاقْتُلُوهُ وَلَا تُحْرِقُوهُ، فَإِنَّهُ لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ))[2]

ترجمہ: "اگر فلاں شخص کو پاؤ تو اس کو آگ میں جلا دینا جب میں چلنے لگا تو آپ ﷺ نے آواز دی پس میں آپ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم فلاں شخص کو پاؤ تو اس کو قتل کرنا جلانا مت۔ کیونکہ آگ کا عذاب وہی دے گا جو آگ کا پیدا کرنے والا ہے۔"

اس طرح آپ نے قیامت کی صبح تک کے انسانوں کو آگ کے عذاب سے محفوظ کر دیا جو صرف اللہ کا حق ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بنو نضیر کی سازشیں اور غداریاں انتہا کو پہنچ گئیں تو حضور ﷺ نے ان کو شہر خالی کر دینے کے لیے دس دن کی مہلت دی۔ لیکن جب وہ اس کے باوجود مقابلہ کے لیے قلعہ بند ہو گئے، تو آپ ﷺ نے ان کے قلعہ کو آگ لگا دینے یا ان کے قتل عام کا حکم اس وقت بھی نہ دیا تھا۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا عذاب دینا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ اسی وجہ سے نبیٔ کریم ﷺ نے حضرت حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو خاص انداز میں دوبارہ بلا کر سمجھایا کہ جلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت کی تذلیل مقصود نہیں۔ لیکن اگر کسی وقت قتل کرنا ضروری ہو تو آسان صورت اختیار کرنے کی تلقین

۱۔ بخاری، صحیح بخاری، كتاب الجهاد والسير، باب قتل الصبيان في الحرب، حدیث: ۲۸۵۱

۲۔ أبو داؤد، سنن ابی داؤد، كتاب الجهاد، باب في كراهية حرق العدو بالنار، حدیث: ۲۶۷۳، حدیث صحیح

۳۔ کاندھلوی، معارف القرآن، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، (مکتبۃ المعارف، دار العلوم حسینیہ، شہداد پور، سندھ، ۱۴۳۳ھ) ص: ۸/ ۳۶۰

کی گئی ہے۔

۳۔مثلہ کرنے کی ممانعت:

جاہلیت کے زمانہ سے یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ شدت انتقام کی وجہ سے لوگ دشمن کی لاش کی بے حرمتی کرتے ہوئے اس کا مثلہ کرتے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ اکثر و بیشتر لوگ اس قسم کے کام پر فخر محسوس کرتے۔ جیسا کہ غزوہ احد کے موقع پر سید حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے ساتھ ایسا کیا گیا تھا جس کو صاحب اصح السیر نے اس کو احد کے واقعے کے درمیان میں ذکر فرمایا ہے اس کے باوجود آپ نے مجھے دین اسلام کو اس کبھی اور بیس رکعت سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

((اغْزُوا بِاسْمِ اللَّهِ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ اغْزُوا وَلَا تَغْدِرُوا وَلَا تَغُلُّوا وَلَا تُمَثِّلُوا وَلَا تَقْتُلُوا وَلِيدًا))[1]

ترجمہ: "اللہ کے نام سے اور اللہ کے راستے میں غزوہ کرو اور اس شخص سے جہاد کرو جو اللہ کا انکار کرے غزوہ کرو، بدعہدی نہ کرو، خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو، اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو۔"

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تکریم انسانیت کے خلاف جتنے بھی رسم و رواج تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نہ صرف اصلاح فرمائی بلکہ ان کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے جملہ اقدامات بھی کیے۔

۴۔تباہ کاری کی ممانعت:

زمانہ جاہلیت میں افواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو تباہ کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا اور قتلِ عام کرنا ایک عام معمول تھا۔ جسے قرآن مجید نے فساد سے تعبیر کیا ہے:

﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾[2]

ترجمہ: "جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔"

مفسرین اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دوران جنگ اگر حربی ضرورت کے تحت درختوں کو کاٹنا پڑے اور دشمن تک پہنچنے کے لیے راستہ کو صاف کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس صورت میں درست ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔ أبو داؤد، سنن ابو داؤد، کتاب الجهاد، باب في دعاءِ المشرکین، حدیث: ۲۶۱۳، حدیث صحیح

۲۔ البقرۃ: ۲/ ۲۰۵

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ﴾(۱)

ترجمہ:"تم نے کھجوروں کے جو درخت کاٹ ڈالے یا جنہیں تم نے ان کی جڑوں پر باقی رہنے دیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فرمان سے تھا۔"

اس آیت کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں کہ:

بنو نضیر کے باغات کھجور کے تھے جب وہ قلعہ بند ہوگئے تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان لوگوں کو غیرت دلانے اور ان پر رعب ڈالنے کے لیے ان کی کھجوروں کے چند درختوں کو کاٹ کر ختم کر دیا اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خیال کیا کہ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی اور یہ درخت اور باغات مسلمانوں کے ہاتھ آئیں گے کہ تو کیوں ان کو ضائع کیا جائے اور وہ ان کے کاٹنے سے باز رہے یہ ایک رائے کا اختلاف تھا اس آیت میں ان درختوں کے کاٹنے جلانے یا ان کو باقی چھوڑنے کے دونوں مختلف عملوں کو باذن اللہ فرمایا اور "وليجزى الفاسقين" میں درختوں کے کاٹنے یا جلانے والوں کے عمل کی توجیہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی فساد میں داخل نہیں بلکہ کفار کو ذلیل کرنے کے ارادہ سے موجب ثواب ہے اس لیے کہ حالت جنگ میں کفار کے گھروں کو منہدم کرنا یا جلانا اسی طرح درختوں کے پتوں کو برباد کرنا جائز ہے یا نہیں اس میں ائمہ فقہاء کے مختلف اقوال ہیں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بحالت جنگ ان سب کاموں کا جائزہ ہونا منقول ہے مگر شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ یہ جواز اس وقت میں ہے جب اس کے علاوہ کفار پر غلبہ پانا مشکل ہو یا اس صورت میں جب مسلمانوں کی فتح کا گمان غالب نہ ہو۔ اور یہ سب کام اس لئے جائز ہیں کہ اس سے کفار کی طاقت و شوکت کو توڑنا مقصود ہو یا عدم فتح کی صورت میں ان کے مال کو ضائع کرنا بھی ان کی قوت کو کمزور کر دینے کے لیے اس میں داخل ہے۔(۲)

ان آیات مبارکہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دورانِ جنگ درختوں، کھیتوں اور بستیوں کو تباہ کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز نہیں۔ ماسوائے کسی خاص ضرورت کے۔ اور یہی بات اصح السیر میں غزوات کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

۵۔ جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کی ممانعت:

زمانہ جاہلیت میں قیدیوں سے انتہائی برا سلوک کیا جاتا تھا۔ انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانا اور ظلم سے قتل کرنا عام دستور تھا لیکن جنگ کے بارے میں دین اسلام نے جہاں دوسرے جاہلانہ امور کی اصلاح فرمائی وہیں قیدیوں کے

۱۔ الحشر:۵۹/۵

۲۔ مظہری، علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، التفسیر المظہری، (بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ)، ص:۱-۲/۲۴۴-۲۴۵

ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کا حکم فرمایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّى إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ذَلِكَ﴾[1]

ترجمہ: "تو جب کافروں سے تمہاری مڈ بھیڑ ہو تو گردنوں پر وار مارو۔ جب ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو اب خوب مضبوط قید و بند سے گرفتار کرو (پھر اختیار ہے) کہ خواہ احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر تاوقتیکہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔"

اس آیت کی تفسیر میں جنگی قیدیوں کے ساتھ دو ہی قسم کے معاملات کرنے کا حکم دیا گیا ہے ایک تو یہ کہ انہیں بطور احسان رہا کر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ بقیہ تفصیل کے لیے حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔[2]

حضور ﷺ کے تمام غزوات و سرایا کا اگر تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے بین الاقوامی جنگی قوانین کے تحت بسا اوقات دشمن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنایا گیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے ذاتی طور پر کوشش کر کے انہیں غلامی سے نجات دلائی۔ اور بعض اوقات آپ ﷺ نے خود فدیہ ادا کر کے دشمن کے جنگی قیدیوں کو رہائی عطا فرمائی اور اصح السیر میں ذکر کئے گئے غزوات و سرایا سے یہ بات واضح طور پر سمجھ آتی ہے۔

۶۔ عین قتل کے وقت کلمہ پڑھنے والے کے قتل کی ممانعت:

اسلام میں جہاد کا مقصد چونکہ قتل و غارت گری مقصود نہیں بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں جتنی جنگیں بھی ہوئیں ان میں حتی الامکان قتل و غارت گری سے منع کیا گیا ہے۔ جس کی واضح مثال

۱۔ محمد: ۴۷/۴

۲۔ خلاصہ یہ ہے کہ سورہ محمد اور سورہ انفال کی دونوں آیتیں جمہور صحابہ ائمہ کے نزدیک منسوخ نہیں، مسلمانوں کے حالات اور ضرورت کے اعتبار سے امام المسلمین کو اختیار ہے کہ ان میں جس صورت کو مناسب سمجھے اختیار کرے۔ علامہ قرطبی نے رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ جنگی قیدیوں کبھی قتل کیا گیا ہے، کبھی غلام بنایا گیا اور کبھی فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا اور کبھی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا گیا۔ فدیہ لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے بدلے میں مسلمان قیدی آزاد کرا دیئے جائیں اور یہ بھی کہ ان سے کچھ مال لے کر چھوڑا جائے دونوں قسم کی صورت میں رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عمل سے ثابت ہیں اس تفصیل کو نقل کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ جس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جن آیتوں کو ناسخ منسوخ قرار دیا گیا در حقیقت وہ سب محکم ہیں ان میں سے کوئی منسوخ نہیں۔ اس لیے کہ جب کفار کی قید ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو امام المسلمین کو چار چیزوں کا اختیار ہے کہ مناسب سمجھے تو قتل کر دے اور مسلمانوں کے لیے مصلحت سمجھے تو ان کو غلام اور لونڈیاں بنا لے اور فدیہ لے کر چھوڑنے میں مصلحت ہو تو مال کا یا مسلمان قیدیوں کا لے کر چھوڑ دے یا بغیر کسی فدیہ کے آزاد کر دے، یعنی علمائے مدینہ کا یہی قول ہے اور یہی قول امام شافی اور ابو عبیدہ کا ہے اور امام طحاوی نے ابو حنیفہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اگرچہ مشہور مذہب ان کا اس کے خلاف ہے۔ (مظہری، التفسیر المظہری، ۷-۸/ ۴۲۱-۴۲۴)

یہ ہے کہ آپ نے غیر مقاتلین کو قتل کرنے سے منع کر دیا۔ اسی طرح ایسے لوگوں کو بھی قتل کرنے سے منع کر دیا جو عین قتال کے وقت کلمۂ توحید ظاہر کر دیں۔ بعض مواقع پر اگر کسی صحابی سے کوئی ایسا واقعہ ہوا جیسا کہ ایک سریہ میں محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہ کو راستہ میں عامر بن الاضبط الاشجعی چند آدمیوں کے ہمراہ ملا۔ اس نے مسلمانوں کی طرح ان لوگوں کو سلام کیا لیکن محلم بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا اور اس کا اونٹ وغیرہ لے لیا۔ جب یہ لوگ واپس مدینہ لوٹے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا۔[1] جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾[2]

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جا رہے ہو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں۔"

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں وسعت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ایک عام ہدایت ہے کہ مسلمان کوئی کام بغیر تحقیق کے محض گمان پر نہ کریں ارشاد ہے "إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا" یعنی جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو محض خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے۔ اس میں سفر کی قید بھی اس وجہ سے ذکر کی گئی ہے کہ یہ واقعہ سفر ہی میں پیش آیا، یا اس وجہ سے کہ زیادہ تر شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں۔ اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے ورنہ اصل حکم عام ہے سفر میں ہوں یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں۔[3]

اس آیت سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے اسلام لائے اور اسلام کے تمام ضروریات کا اقرار کر لے تو ہم اسے مسلمان ہی سمجھیں گے اس کے دل کا حال اللہ پر چھوڑیں گے اور اس کو میدان جنگ میں قتل نہ کریں گے۔ اور آیت کی تفسیر سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی ہے کہ مسلمان کو کوئی کام بغیر تحقیق کے محض گمان پر نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی حالت جنگ ہو، حضر ہو یا سفر ہر حال میں تحقیق ضروری ہے۔

۷۔ مصالحت اور جنگ بندی:

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے اور وہ اپنے ماننے والوں کو فقط اس وقت جنگ کی اجازت دیتا ہے جب اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر اب جنگ نہ کی تو باطل مسلمانوں کے امن واستحکام کو یقینی نقصان پہنچائے گا ان

۱۔ داناپوری، اصح السیر، ص: ۲۹۵-۲۹۶

۲۔ النساء: ۴/ ۹۴

۳۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ص: ۱/ ۴۲۴-۴۲۵

حالات میں جہاد سے گریز اہل اسلام کی شایانِ شان نہیں بلکہ بزدلی اور نامرادی ہے جسے اسلام اپنے ماننے والوں کے لئے ہرگز گوارا نہیں کرتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾[1]

ترجمہ: "اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو بھی صلح کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ۔"

اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جب کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ کو بھی اختیار ہے کہ اگر مسلمانوں کی مصلحت صلح میں محسوس کریں تو صلح کرسکتے ہیں۔ اور "وَإِنْ جَنَحُوا" کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح اسی وقت کی جاسکتی ہے جب کفار کی طرف سے صلح کی خواہش ظاہر ہو کیونکہ بغیر ان کی خواہش کے اگر مسلمان خود ہی صلہ کی تحریک کریں تو یہ ان کی کمزوری سمجھی جائے گی۔

ہاں اگر کوئی موقع ایسا آن پڑے کہ مسلمان کسی نرغہ میں گھر جائیں اور اپنی سلامتی کے لیے کوئی صورت جو صلح کے علاوہ نظر نہ آئے تو صلح میں پیش قدمی بھی بقول فقہاء جائز ہے۔

اور چونکہ دشمن کی جانب سے صلح کی خواہش ہونے میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر غفلت میں ڈال دیں، اور پھر یکبارگی حملہ کر دیں۔ اس لیے آخر آیت میں رسول کریم ص وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ "وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ" وہ اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ وہی خوب سننے والے جاننے والے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کو بھی سنتے ہیں اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی جانتے ہیں وہ آپ کی مدد کے لیے کافی ہیں آپ بے دلیل احتمالات پر اپنے کاموں کی بنیاد نہ رکھیں اور ایسے خطرات کو اللہ کے حوالہ کر دیں۔[2]

سید مودودی اس پہلو پر کچھ اس طرح بات کرتے ہیں کہ:

"بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگو کرتے ہوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے تو بے تکلف اس کے لئے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لئے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہر حال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خونریزی کو طول کیوں دو۔ اور اگر وہ غداری کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں اللہ تعالی کے بھروسہ پر بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے

۱۔ الانفال:۸/۶۱

۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ص:۲/۱۱۶

بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تا کہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو۔اور لڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت بازو سے توڑ کر پھینک دو تا کہ کبھی کوئی غدار تمہیں نرم چارہ سمجھنے کی جرت نہ کرے۔"[1]

جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے زمانہ میں بہت سے قبیلوں سے صلح کی یعنی ان کے ساتھ معاہدات کیے جیسا کہ صلح حدیبیہ ہے اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ صلح سے بڑھے ہوئے ہاتھ کی تکریم کرنی چاہیے۔اسلام میں صلح کی اہمیت سابقہ بحث سے واضح ہوگئی ہے لیکن یہ بات بھی اہمیت کے حامل ہے کہ اسلام میں اس کا مقام کیا ہے اور اس کی مدت کتنی ہونی چاہیے۔

اس بارے میں مولانا ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں کہ:

"فقہاء کرام نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ مسلمان فرمانروا کافروں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر سکتا ہے مگر جہاں تک ممکن ہو صلح کی مدت کم مقرر کرے اور دس سال سے زیادہ کا معاہدہ نہ کرے جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے حدیبیہ میں قریش سے دس سال کے لیے معاہدہ کیا اس سے زیادہ مدت کے لئے کبھی کسی سے معاہدہ نہیں کیا۔بہر حال ایک مدت معائنہ کے لئے کافروں سے صلح جائز ہے اور اس مدت میں اگر کفار اپنے عہد کو توڑ ڈالیں تو وہ بجائے معاہد کے محارب سمجھے جائیں گے ،بلا اطلاع کے ان پر چڑھائی اور فوج کشی جائز ہو گی۔جیسے قریش نے صلح حدیبیہ کو توڑا تو حضور ﷺ نے بلا اعلان جنگ قریش پر حملہ کے لیے روانہ ہوئے اور مکہ کو فتح کر لیا۔"[2]

رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر کفار کے ساتھ معاہدہ فرمایا کہ کفار اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہ کی جائے گی اور اس لیے بھی کہ بطورِ مصلحت لڑائی کا چھوڑنا بھی معنی جہاد ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کی بھلائی ہو کیونکہ مقصود شر کا دفع کرنا ہے جو اس سے حاصل ہے۔

دیگر جنگی اصول و قواعد

غزوات و سرایا سے اخذ کردہ درج ذیل جنگی اصول و قواعد اور نتائج و ثمرات کو اختصاراً پوائنٹس کی صورت میں ذکر کیا جارہا ہے۔

- حضور ﷺ جنگ شروع ہونے سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لیتے تھے کہ دشمن سے پیٹھ نہ پھیریں اور کبھی موت پر بھی بیعت لیتے تھے اور جہاد کے اقرار کی بھی اسی طرح لیتے تھے جس طرح اسلام قبول

۱۔ مودودی،سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القران،(ادارہ ترجمان القرآن،لاہور،اپریل:۲۰۰۴ء)ص:۲/۱۵۶

۲۔ کاندھلوی،مولانا ادریس کاندھلوی،معارف القران،(مکتبہ المعارف،دارالعلوم حسینیہ،شہداد پور،سندھ،پاکستان،۱۴۲۲ھ)ص:۳/۳۵۶

کرنے کی لیتے ہیں۔

- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جہاد کے سلسلہ میں ہر بات پر اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے یعنی کہ جہاد کے موقع پر منزل کا انتخاب کرنا وغیرہ۔
- حضور ﷺ دشمن کی جنگی پالیسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے جاسوس مقرر فرماتے تھے اور دشمن کے جاسوس کو بعض قتل کا حکم دیتے تھے۔
- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ اپنے مشورہ اور ارادہ کو دشمن سے مخفی رکھتے تھے۔
- اسی طرح حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ کسی غزوہ میں جاتے وقت صحیح مقام بہت کم بتاتے تھے۔
- نفیر عام کے بعد جو شخص جہاد میں شریک نہ ہوتا تھا حضور ﷺ اس سے سخت ناراض ہوتے تھے۔
- حضور ﷺ لشکر کی ترتیب اور مقاتلہ کی تنظیم کا بہت اہتمام کرتے تھے۔
- حضور ﷺ جنگ کے لیے زرہ اور سلاح حرب کا بندوبست جہاں تک ممکن ہوتا کرتے، کم ہوتا تو عاریتاً بھی لے لیتے تھے اور اگر ضرورت پڑتی تو کافروں سے بھی یہ چیزیں عاریتاً لے لیتے تھے۔
- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ سفر کے وقت فوج کی راحت کا خیال رکھتے تھے اور دھوپ کی تیزی کے وقت قیام کر لیتے تھے۔ جیسا کہ غزوۂ بنی المصطلق سے لوٹتے وقت عبد اللہ بن ابی کی شرارت کی وجہ سے دھوپ کی تیزی کے وقت بھی آپ ﷺ نے سفر جاری رکھا، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ تو ایسے وقت پر سفر نہیں کیا کرتے تھے تو حضور ﷺ نے مجبوری بیان کر دیں۔
- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب دشمن کے مقام کے قریب پہنچتے تو لشکر کو روکتے اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعا کرتے پھر فرماتے کہ اب آگے بڑھو۔
- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ لشکر کو صبر و استقامت کی تلقین فرماتے تھے، دشمن کی تعداد اور تیاری زیادہ ہوتی تو صحابہ سے کہتے کہ فتح و نصرت کثرت تعداد اور آلات حرب پر موقوف نہیں ہے بلکہ اصل چیز اس کے لیے خدا پر اعتماد اور صبر و استقامت ہے۔
- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ دشمن پر حملہ صبح کے وقت کرتے تھے یا آفتاب ڈھلنے کے بعد ٹھنڈے وقت میں، رات کے وقت حضور ﷺ خود حملہ نہیں کرتے تھے اگر دشمن کی طرف حملہ ہو جائے تو پھر دفاع کے لیے لڑتے تھے۔
- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ عین معرکۂ جنگ میں ان کافروں کو جن سے لڑائی ہو رہی ہوتی دھوکا دینے کی اجازت دیتے تھے اور فرماتے تھے: الحرب خدعہ

- حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ عورتوں، لڑکوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع فرماتے تھے۔ البتہ جو بوڑھا اہل الرائے اور صاحب تجربہ ہوتا اور کفار اس کی رائے سے فائدہ اٹھاتے تو ایسے بوڑھے کے قتل کی اجازت دیتے تھے۔
- جب حضور ﷺ سرایا بھیجتے تو ان لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ منکرین خدا کو قتل کرو مگر مثلہ نہ کرو، کفار سے جب کچھ معاہدہ کرو تو بدعہدی نہ کرو۔
- حضور ﷺ نے بہت دفعہ کفار کی اعانت قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر خیبر اور بعض دوسرے مواقع میں آپ ﷺ نے مشرکین اہل کتاب سے مدد لی۔ اور غنیمت میں ان کو اس کا بدلہ بھی دیا، مگر صحابہ کی طرح ان کا باقاعدہ حصہ مقرر نہ فرمایا۔ غزوۂ ہوازن میں کفار قریش بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہو گئے تھے اور آپ ﷺ نے ان کو شرکت سے منع نہ کیا۔
- حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ دشمن کے علاقہ میں قرآن پاک ساتھ نہ لے جایا کرو۔
- حضور ﷺ امیر سریہ کو حکم دیتے تھے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اسلام اور ہجرت کی یا صرف اسلام کی دعوت دو اگر قبول نہ کریں تو جنگ کرو۔ لیکن بعض سرایا کے مطالعہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ بعض دفعہ اصحاب سرایا چھپے رہے جب دشمن غافل سو گئے تب ان لوگوں نے حملہ کیا بعض جگہ جاتے ہی حملہ کیا، اور بعض جگہ تو دشمن کو اطلاع ہو گئی اور وہ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے اور اصحاب سریہ نے ان کے اموال پر حملہ کر دیا ایسے مقامات میں بہ ظاہر پہلے سے دعوت اسلام کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو پہلے سے دعوت اسلام پہنچ چکی تھی۔
- آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ جہاں اذان کی آواز سنو یا اسلام کی کوئی علامت معلوم ہو وہاں حملہ نہ کرو۔
- جو شخص کلمہ پڑھ لے اگرچہ اس نے تلوار کے خوف سے پڑھا ہو اس کے قتل کرنے سے حضور ﷺ منع فرماتے تھے۔ صحابہ کہتے تھے کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا آپ ﷺ فرماتے کہ کیا آپ نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔
- حضور ﷺ کا عموماً غزوات میں قاعدہ یہ تھا کہ فتح کے بعد وہاں تین دن قیام فرماتے اور مال غنیمت کو کبھی وہی تقسیم کرتے، کبھی وہاں سے چل کر راستہ میں اور کبھی مدینہ پہنچ کر۔
- اکثر غزوات میں کوئی نہ کوئی ام المومنین آپ ﷺ کے ساتھ ہوتی تھیں۔

- غزوات میں قبائل کی کچھ عورتیں بھی کبھی ساتھ ہو جایا کرتی تھیں جو زخم کا علاج اور مرہم پٹی کرنا جانتی تھیں یا بیمار کی خدمت کرتی تھیں یا پانی پلایا کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ غلام بھی ساتھ ہوتے تھے، کبھی کفار بھی ساتھ ہو جاتے تھے یا کسی کام کے لیے ساتھ لے لیے جاتے تھے، ان لوگوں کو غنیمت میں سے ان کی خدمتوں کا لحاظ کر کے حضور ﷺ کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے مگر عورتوں، غلاموں اور کفار کو غنیمت میں حصہ کبھی نہیں دیا گیا۔
- مال غنیمت میں سے چھپا کر کچھ لینے کو آپ ﷺ کبائر میں شمار کرتے تھے جیسا کہ حنین کے مال غنیمت کو تقسیم کرتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ غلول عیب ہے جہنم کی آگ ہے اور قیامت کے روز مصیبت عظمی ہے۔

فصل دوم

عصرِ حاضر میں ان جنگی اصول و قواعد سے استفادہ کی صورتیں

عصر حاضر میں جہاد کے ان اصولوں (جو اوپر بیان کیے جاچکے ہیں) سے کیسے استفادہ حاصل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ موجودہ حالات میں ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے جدید جنگی ہتھیاروں اور ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال نے فقہاء کے بیان کردہ ان جنگی اصولوں پر عمل کرنا بعض صورتوں میں انتہائی مشکل ہوگیا ہے۔ اس کے لیے چند ایک صورتوں کو ذیل میں بیان کیا جارہا ہے جس سے قارئین کے لیے عصر حاضر کے تناظر میں فریضۂ جہاد کی نوعیت، بین الاقوامی اسلامی دفاعی نظام اور آداب القتال کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

فریضۂ جہاد کی نوعیت :

اس بات پر بالعموم اتفاق پایا جاتا ہے کہ جہاد امت کے لیے فرض کفائی کی حیثیت رکھتا ہے۔[۱] لیکن چند باتیں اس سلسلے میں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فرض کفائی کا عام طور پر یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اگر "کچھ لوگ" اس فریضے کو ادا کریں تو باقی کے ذمے سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر "کافی لوگ" اس فریضے کو ادا کرلیں تو باقی کے ذمے سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔[۲] دوسری بات یہ کہ فرض کفائی صرف عام حالات میں ہی فرض کفائی ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ فرض عین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیا اس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہر مسلمان لازمی طور پر بنیادی جنگی قواعد اور آداب سے واقف ہو اور نیز اسے بنیادی فوجی تربیت دی گئی ہو؟ تیسری بات یہ ہے کہ امت اب پچاس سے زائد ریاستوں میں بٹ گئی ہے۔ موجودہ حالات میں اس فرض کفائی کی ادائیگی کیسے ہوگی؟ اس کا ایک مناسب حل یہ نظر آتا ہے کہ مسلمان ریاستیں آپس میں دفاعی معاہدات کرلیں اور یوں ان میں کسی ایک پر حملہ سب پر حملہ متصور ہو۔ اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵۱ کے تحت اس انتظام کی گنجائش ہے اور "معاہدۂ شمالی اوقیانوس کی تنظیم" (NATO) اس انتظام کی کامیابی کی سب سے واضح دلیل ہے۔

۱۔ سفیان ثوری کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ عام حالات میں جہاد کو مندوب (سنت) سمجھتے تھے۔ ان کا استدلال ان آیات و احادیث سے تھا جن میں جہاد کے لیے نہ جانے والوں کے لیے بھی اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (مثلاً سورۃ النسآء، آیت ۹۵) اس کے برعکس سعید بن المسیب کا موقف یہ تھا کہ جہاد فرض عینی ہے۔ وہ ان آیات و احادیث سے استدلال کرتے تھے جن میں جہاد کے لیے نہ جانے والوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔ (مثلاً سورۃ التوبۃ، آیت ۳۸۔۳۹) فقہائے امت کی اکثریت کا موقف یہ رہا ہے کہ جہاد عام حالات میں فرض کفائی ہے اور بعض اوقات یہ فرض عینی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: (المرغینانی، برہان الدین، الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، کتاب السیر، (بیروت: دار الفکر)، ج ۲، ص ۳۷۸؛ شربینی، مغنی المحتاج، ص: ۴/۲۰۹)

۲۔ فرض کے مفہوم کی وضاحت کے لیے دیکھیے: (الغزالی، ابو حامد، المستصفیٰ من علم الاصول، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ص: ۱/۶۷۔۷۰)

فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ حملے کی زد میں آئے ہوئے علاقے کے لوگ اگر حملے کے خلاف دفاع نہ کر سکتے ہوں تو ان قریبی علاقوں پر یہ فریضہ عائد ہو گا۔ پھر اگر وہ بھی دفاع کی اہلیت نہ رکھتے ہوں یا وہ فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو ان کے بعد کے علاقوں پر یہ فریضہ عائد ہو گا، یہاں تک کہ یہ فریضہ دنیا کے تمام مسلمانوں پر عائد ہو جائے گا۔[1] گویا اسلامی ملک پر حملے کو کوئی مسلمان پرایا جھگڑا نہیں سمجھے گا، بلکہ دفاع کو اپنا فریضہ سمجھ کر ہوشیار اور بیدار رہے گا، کیونکہ کسی بھی وقت یہ امکان ہو سکتا ہے کہ یہ فریضہ اس کے حق میں فرض عین ہو جائے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ملک پر حملے کی صورت میں پوری امت مسلمہ میں ایک ایمر جنسی کی سی کیفیت پیدا ہو۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا قریبی علاقوں پر فریضہ عائد ہونے کا سبب یہ تھا کہ دور کے علاقوں کی بہ نسبت وہ حملے کے خلاف دفاع کے لیے زیادہ بہتر پوزیشن پر ہوتے تھے؟ موجودہ دور میں جبکہ ذرائع مواصلات نے بہت ترقی کی ہے قرب و بعد کے پیمانے بہت تبدیل ہو چکے ہیں۔ کیا اب زیادہ اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ کس مسلمان ملک کے پاس زیادہ بہتر ہتھیار پائے جاتے ہیں ؟ کس ملک کی معاشی پوزیشن زیادہ مستحکم ہے؟ کون سا ملک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے ہے؟ ظاہر ہے کہ جو زیادہ اہلیت رکھے گا، اس پر فریضہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ جلدی عائد ہو گا۔ اس لحاظ سے یہ عین ممکن ہے کہ قریبی ملک کی بہ نسبت، جو فوجی مہارت اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے پسماندہ ہو، ایک دور دراز کے ملک، جس کے پاس ایٹمی ہتھیار بھی ہوں اور وہ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بھی آگے ہو، پر دفاع کا فریضہ جلدی عائد ہو۔

جہاد اور نظم حکومت :

عصر حاضر میں جہاد کے حوالے سے ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا جہاد کے فریضے کی ادائیگی کے لیے حکومتی نظم کا ہونا ضروری ہے یا افراد اور غیر سرکاری تنظیمیں بھی جہاد کا اعلان کر سکتی ہیں۔ مسلمان اہل علم اس سلسلے میں تین گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ بعض اہل علم سرے سے اس شرط کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لیے حکومتی نظم ایک مناسب امر تو ہے مگر جہاد اس کے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے، بالخصوص جبکہ مسلمان حکمرانوں کے متعلق بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ عوام کی خواہشات کے ترجمان نہیں ہیں اور جہاد سے جی چراتے ہیں۔[2] کچھ اہل علم ایسے ہیں جن کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ فریضۂ جہاد کی صحیح ادائیگی کے لیے اسے ایک لازمی شرط قرار دیتے ہیں کہ اسے نظم حکومت کے تحت رہ کر کیا جائے۔[3] ایک تیسرا گروہ ان اہل علم کا ہے جو دفاع کی صورت میں اس شرط کے

۱۔ شامی، محمد امین بن عبد العزیز، رد المحتار علی الدر المختار، (القاہرۃ: دار الفکر، ۱۹۶۶ء) ص: ۳/ ۲۰۴

۲۔ احسان الحق شہباز، جہاد اور اذن حکومت، (لاہور: دار الاندلس، ۲۰۰۳ء)، ص: ۸۱۔۹۷

۳۔ غامدی، قانون جہاد، ص: ۲۴۳۔۲۴۵

قائل نہیں لیکن اسے اقدام کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔[1] اس اختلاف رائے کی وجہ سے دیگر کئی امور پر بھی اختلاف ہوا۔ مثلاً آزادی کی مسلح تحریکوں کے جواز اور عدم جواز کے مسئلے کا بھی بہت حد تک انحصار اسی بنیادی امر پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حکومتی نظم کے بغیر جہاد جائز نہ ہو تو پھر مسلح جدوجہد آزادی کو کیسے جہاد قرار دیا جاسکتا ہے؟

جہاد اور مسلح جدوجہد آزادی :

عصر حاضر میں جہاد اور مسلح جدوجہد آزادی کے تعلق نے بھی بہت اہمیت اختیار کی ہے۔ کئی جگہوں پر غیر ملکی تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت کا سلسلہ جاری ہے اور اسے جہاد ہی کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض اہل علم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اگر غیر ملکی تسلط کے تحت مسلمانوں کے لیے دین پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے تو ان کے پاس صرف یہی راستہ ہو گا کہ یا تو وہ وہاں سے ہجرت کریں اور یا کسی اسلامی ملک کی مدد طلب کریں۔ گویا ان اہل علم کے نزدیک غیر ملکی تسلط کے خلاف مسلح جدوجہد ناجائز ہو گی۔ اس عدم جواز کے لیے ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس قسم کی مسلح مزاحمت نظم حکومت کے بغیر کی جاتی ہے جبکہ جہاد کے لیے نظم حکومت کا ہونا ضروری ہے۔[2]

یہاں اسلامی قانون کے لحاظ سے چند اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اولاً کیا حکومت اور ریاست بذات خود مقصود ہیں، یا فریضۂ دفاع و اعلاء کلمۃ اللہ کے اچھے طریقے سے انجام دینے کے لیے ایک ذریعہ ہیں؟ اگر کبھی اسلامی ملک پر حملے کے نتیجے میں وہاں کی حکومت کا عملاً خاتمہ ہو جائے اور ابھی جنگ جاری ہو تو کیا پھر بھی دفاع کا فریضہ ادا کرنے کے لیے باقاعدہ نظم حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہو گی؟ یا مزاحمت کرنے والے آپس میں کسی کو امیر منتخب کر کے اس کی اطاعت کا اقرار کریں تو یہ حکومت کا بدل ہو جائے گا؟ اسی طرح وہ لوگ جو کسی ظالمانہ نظام سے آزادی چاہتے ہوں تا کہ اپنے حقوق کا تحفظ کریں تو کیا ان پر بھی ریاست و حکومت کے تحت لڑنے کی شرط لاگو ہوتی ہے؟ وہ تو لڑیں گے ہی اس مقصد کے لیے کہ اپنی ریاست اور حکومت قائم کر سکیں۔

شرعاً مسلمانوں پر اس سرزمین سے ہجرت واجب ہو جاتی ہے جہاں وہ اپنے دین پر عمل نہ کر سکتے ہوں۔[3] تاہم عصر حاضر کے مخصوص معروضی حالات کی وجہ سے بعض اوقات مظالم کے باوجود ہجرت ناممکن یا نامناسب ہوتی ہے،

۱۔ مبشر لاہوری، اسلام میں تصور جہاد، ص:۱۷۷۔۱۸۶اور ۲۵۶۔۲۶۰

۲۔ غامدی، قانون جہاد، ص:۲۴۳۔۲۴۵

۳۔ ابن قدامہ نے ہجرت کے وجوب کے سلسلے میں دو عوامل ذکر کیے ہیں: کیا مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کی اجازت ہے؟ کیا مسلمان وہاں سے ہجرت کر سکتے ہیں؟ پھر وہ تین صورتیں ذکر کرتے ہیں۔ اولاً: اگر مسلمانوں کو دین پر عمل کرنے کی اجازت نہ ہو اور وہ ہجرت کر سکتے ہوں تو ان پر ہجرت واجب ہو جاتی ہے ثانیاً: اگر ان کو دین پر عمل کرنے کی اجازت نہ ہو مگر وہ ہجرت نہ کر سکتے ہوں تو ان پر ہجرت نہ واجب ہوتی ہے اور نہ مندوب۔ ثالثاً: اگر ان کو دین پر عمل کرنے کی اجازت ہو اور وہ ہجرت کر سکتے ہوں تو ان پر ہجرت واجب نہیں ہوتی مگر مندوب ہوتی ہے۔ (المغنی، ص:۸ /۳۳۶) ایک چوتھی صورت بھی ممکن ہے جو ابن قدامہ نے نہیں ذکر کی۔ اگر ان کو دین پر عمل کرنے کی اجازت ہو اور وہ ہجرت نہ کر سکتے ہوں یا انہیں ہجرت کی اجازت نہ ہو تو ایسی صورت میں کیا حکم ہو گا؟

مثلاً: جب مظلوموں کی تعداد لاکھوں میں ہو، جب قریب ترین اسلامی ملک بہت دور ہو جہاں کثیر تعداد میں مسلمانوں کے لیے ہجرت کر کے جانا ناممکن ہو یا انتہائی حد تک مشکل ہو، جب اسلامی ملک اتنی کثیر تعداد میں آنے والے مہاجرین کی آباد کاری کے وسائل نہ رکھتا ہو اور جب وہ غیر مسلم ملک انہیں ہجرت بھی نہ کرنے دیتا ہو۔

کیا ان صورتوں میں لاکھوں لوگوں کو گھر بار چھوڑ کر نکل جانے کا حکم دیا جائے گا؟ کیا اس سرزمین کو اسلام کے دشمنوں کے لیے خالی چھوڑا جا سکتا ہے؟ ایسی صورت میں اگر مظلوم دیگر مسلمانوں سے مدد طلب کر سکتے ہیں تو وہ خود اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے طاقت کیوں نہیں استعمال کر سکتے؟ شریعت نے فرد کو حق دفاع شخصی کے تحت طاقت کے استعمال کی اجازت دی ہے۔[۱] اگر فرداً فرداً ایک ایک مظلوم کو یہ حق حاصل ہے، تو کیا بہت سارے مظلوم مل کر ایک دوسرے کا تحفظ نہیں کر سکتے؟[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو بھی شہید قرار دیا ہے۔[۳] کیا اس بنیاد پر وطن کی آزادی کی تحریک کو جہاد کے مفہوم میں داخل سمجھا جا سکتا ہے؟ اگر آزادی کی تحریکیں غیر اسلامی نظام یا مقاصد کے حصول کے نعرے بلند کریں تو ان کی جدوجہد کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟ اس کا جواب غالباً یہی ہو گا کہ اگر آزادی کی تحریک کے رہنما تو ایسی صورت میں اس تحریک کو جہاد نہیں کہا جا سکے گا، اگرچہ افراد کو حق دفاع شخصی پھر بھی حاصل رہے گا۔

غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی مدد :

اجتماعی حق دفاع کے طریقہ کار کا فائدہ صرف "ریاستیں" ہی اٹھا سکتی ہیں۔ جبکہ امت مسلمہ صرف مسلم ممالک تک ہی محدود نہیں بلکہ کئی ممالک میں مسلمان بطور اقلیت رہ رہے ہیں۔ ان ممالک میں اگر مسلمان ظلم کا شکار ہوں تو ان کی مدد کیسے کی جائے گی؟ دوسرے ممالک میں ظلم کے شکار مسلمانوں کی مدد کے لیے جہادی کاروائی کو بہت سے مسلمان اہل علم "دفاعی جہاد" کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ لیکن جدید بین الاقوامی قانونی نظام میں اسے دفاع نہیں متصور کیا جا سکتا۔ اقوام متحدہ کے وجود میں آنے سے پہلے جو رواجی بین الاقوامی قانون (Customary International Law) تھا اس کے تحت دفاع کا تصور بہت وسیع تھا اور اس میں ریاست کے لیے یہ حق تسلیم کیا گیا تھا کہ اگر اس کے کچھ باشندے کسی غیر

۱۔ سورۃ النحل، ۱۶/۱۲۶

۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں کہ ریاستوں کی خود مختاری در حقیقت افراد کی آزادی کی وسیع تر شکل ہے۔ کیا اس بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ریاستوں کا حق دفاع بھی در اصل افراد کے حق دفاع کی وسیع شکل ہے؟ جس طرح افراد کی آزادی ریاست کی خود مختاری میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح افراد کا حق دفاع بھی وقت کے ساتھ ساتھ ریاست کے حق دفاع میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں مختلف مراحل آتے ہیں اور ان میں ایک اہم مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ افراد مل کر اپنے انفرادی حق دفاع کو مشترکہ حق دفاع کی شکل دے دیتے ہیں۔ وہ منظم ہو کر ایک گروہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ایک پر حملے کو سب پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت کرنے والی تنظیموں کا اصل کام یہی ہے۔ (The Muslim Conduct of State, p 71)

۳۔ سنن الترمذی، کتاب الدیات، حدیث: ۱۳۴۰۔۱۳۴۱

ملک میں خطرے میں ہوں اور وہ ملک ان کی حفاظت سے قاصر یا انکاری ہو تو ایسی صورت میں اس ملک کو اپنے باشندوں کی حفاظت کے لیے مناسب اقدام کا اختیار حاصل ہو جاتا تھا اور اسے دفاع میں شمار کیا جاتا تھا۔[1] کیا یہ حق اب بھی ریاستوں کو حاصل ہے؟ اس سوال کے جواب پر بین الاقوامی قانون کے ماہرین کا اختلاف ہے۔ کچھ اب بھی اس حق کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور کچھ کے نزدیک اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۲ ذیلی دفعہ ۴ نے طاقت کے استعمال کی تمام صورتوں پر پابندی عائد کر دی ہے اور اب صرف انہی صورتوں میں طاقت کا استعمال جائز ہو گا جن کی منشور نے صراحتاً اجازت دی ہے یعنی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی اجازت سے مشترکہ فوجی کاروائی اور منشور کی دفعہ ۵۱ میں مذکور شرائط کے تحت دفاعی جنگ۔[2] لیکن جو ماہرین دوسرے ممالک میں اس قسم کی کاروائی کو جائز سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اس قسم کی کاروائی اسی ملک کے لیے جائز ہوتی ہے جس کے "شہری" خطرے میں ہوں۔[3] اب مسئلہ یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون میں اس وقت "شہریت" (Citizenship) اور "قومیت" (Nationality) کے جو تصورات رائج ہیں ان کے تحت کینیڈا کے مسلمانوں کو پاکستان کے شہری نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس لیے اگر ان پر ظلم ہو رہا ہو تو پاکستان ان کی مدد کے لیے فوجی کاروائی نہیں کر سکتا۔ مسئلہ صرف بین الاقوامی قانون کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ اسلامی قانون کے لحاظ سے بھی یہاں چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اور واضح رہے کہ دارالاسلام میں بھی دارالاسلام سے باہر مستقل طور پر مقیم مسلمانوں کو دار الاسلام کے "شہری" نہیں قرار دیا جاتا تھا۔ اس لیے ان پر حملہ دارالاسلام پر حملہ متصور نہیں ہوتا تھا۔ البتہ چونکہ وہ امت کا حصہ تھے اس لیے دفاع امت کے نظریے کے تحت دارالاسلام کے مسلمانوں پر ان کی مدد لازم ہوتی تھی۔ کیا عصر حاضر میں غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیت کی مدد کے لیے "انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مداخلت" (Humanitarian Intervention) کے تصور کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟

کسی دوسری ریاست میں "ہمدردی کی بنیاد پر مداخلت" اس وقت کی جاتی ہے جب وہ ریاست خود اپنے باشندوں یا اپنے ہاں مقیم غیر ملکی لوگوں کو ظلم کا نشانہ بناتی ہے۔[4] اس قسم کی کاروائی کو بعض ممالک جائز قرار دیتے ہیں۔ جیسے ۱۹۷۱ء میں جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تھا تو اس کے لیے ایک جواز یہی پیش کیا گیا تھا کہ پاکستانی فوج بنگالیوں پر مظالم

---

1. Dixon, International Law, pp,8-307

۲۔ مذکورہ دفعہ میں دفاع کی صورت میں طاقت کے استعمال پر دو شرائط عائد کی گئی ہیں۔ اولاً: کسی ملک پر فوجی حملہ ہو۔ گویا اقتصادی ناکہ بندی یا طاقت کے استعمال کی دھمکی کی صورت میں حق دفاع حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے باقاعدہ فوجی حملہ ہونا ضروری ہے۔ ثانیاً: حق دفاع کے تحت طاقت اس وقت تک استعمال کی جاسکے گی جب تک سلامتی کونسل اس معاملے پر کاروائی شروع نہ کرے کیونکہ اس کے بعد ہر قسم کی کاروائی کا اختیار سلامتی کونسل کو حاصل ہو جاتا ہے۔

3. D. J. Harris, Cases and Materials on International Law, (London: Sweet & Maxwell,1991) pp 861-68.

4. Thomas M. Franck, When, If Ever, States May Use Force without Prior Security Council Authorization?, SJICL (2000), 4, 371-76; N. W.

ڈھارہی تھی۔ ماضی قریب میں سربیا پر نیٹو کی بمباری کے لیے بھی ایک جواز یہی فراہم کیا گیا تھا۔ جو لوگ اسے جائز قرار دیتے ہیں ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۳۹ کے تحت جن صورتوں میں کسی ریاست کے خلاف کاروائی ضروری ہو جاتی ہے ان میں ایک صورت یہ ہے کہ اس ریاست کی طرف "امن عالم کو خطرہ" ہو، اور یہ بھی قانونی طور پر مسلمہ ہے کہ "امن عالم کو خطرہ" کسی ریاست کے "اندرونی معاملات" سے بھی ہو سکتا ہے۔ پس اصولاً کسی ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت ناجائز ہے لیکن جب ان اندرونی معاملات سے امن عالم کو خطرہ ہو تو پھر مداخلت جائز ہو جاتی ہے، جیسا کہ منشور کی دفعہ ۲ ذیلی دفعہ ۷ میں وضاحت کی گئی ہے۔ تاہم اس موقف پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دفعہ ۳۹ کے تحت اس قسم کے معاملات میں کاروائی کا اختیار سلامتی کونسل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ انفرادی طور پر ریاستوں کو۔ پس اگر سلامتی کونسل انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کسی ریاست کے اپنے باشندوں پر ظلم کو روکنے کے لیے کاروائی کرے تو اس کے جواز میں کے متعلق کوئی اشکال نہیں پایا جاتا لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ حق انفرادی طور پر ریاستوں کو بھی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ریاست نے بھی اس قسم کی کاروائی میں تنہا "انسانی ہمدردی" کو ہی بنیاد نہیں بنایا بلکہ دیگر جواز بھی ساتھ ساتھ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً بھارت نے مشرقی پاکستان میں کاروائی کے لیے اپنے حق دفاع کو بھی جواز کے طور پر پیش کیا اور نیٹو نے سربیا پر بمباری کے ضمن میں سلامتی کونسل کی "قراردادوں پر عملدرآمد" کو بھی ایک بنیاد کے طور پر پیش کیا۔ پس سلامتی کونسل کی منظوری کے بعد اگر کوئی ریاست یا ریاستوں کا مجموعہ اس قسم کی کاروائی کرے تو اسے قانونی طور پر جائز سمجھا جائے گا لیکن سلامتی کونسل کی منظوری کے بغیر محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کسی دوسری ریاست میں فوجی کاروائی کا جواز کم از کم یقینی نہیں ہے۔

لہٰذا اگر مسلمان ممالک دفاع کے اسلامی تصور کو عصر حاضر میں عملی شکل دینا چاہتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ ایک طرف تمام اسلامی ممالک آپس میں دفاعی معاہدات کریں، تاکہ ایک پر حملہ سب پر حملہ تصور کیا جائے۔ دوسری طرف ان پر لازم ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر مشترکہ موقف اپنا کر مؤثر انداز میں آواز بلند کریں۔ مشترکہ دفاعی معاہدات کے بعد وہ سلامتی کونسل میں مستقل نشست بھی حاصل کر سکتے ہیں، جس پر امت مسلمہ کی نمائندگی مختلف ممالک باری باری کریں۔ اگر مسلم ممالک بدستور اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے تنہا کوشش کرتے رہیں گے تو امت مسلمہ کے دفاع کا فریضہ کبھی ادا نہیں ہو سکے گا۔

آداب القتال :

آداب القتال کے متعلق شریعت نے کچھ تفصیلی احکام دیے ہیں؛ مثلاً عورتوں اور بچوں کو نشانہ بنانے کی ممانعت، معاہدات کی پابندی کا حکم، مثلہ کی ممانعت وغیرہ جنکی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔[1] اس سلسلے میں اسلامی قانون نے معاملہ

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، حدیث: ۳۲۶۱

بالمثل (Reciprocity) کا قاعدہ بھی مانا ہے۔ تاہم محض معاملہ بالمثل کی بنیاد پر شریعت کے احکام کی خلاف ورزی جائز نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر دشمن مسلمانوں کے شہریوں کو نشانہ بنائیں گے تو جواباً مسلمان بھی ان کے شہریوں کو نشانہ بنائیں گے جبکہ مسلمان ایسی کاروائی ہرگز نہیں کریں گے۔ [1] اس قسم کی کاروائی صرف اسی وقت جائز ہو سکتی ہے جب جنگی ضرورت کی وجہ سے حملہ ناگزیر ہو اور شہریوں کا بچانا ممکن نہ ہو۔ اسے بین الاقوامی قانون کی اصطلاح میں "ضمنی نقصان" (Collateral Damage) کہتے ہیں۔ پس معاملہ بالمثل کے ساتھ ایک متوازی قاعدہ اضطرار کا بھی ہے۔

یہاں ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان دیگر قوموں کے ساتھ آداب جنگ کے تعین کے لیے معاہدات کر سکتے ہیں؟ عصر حاضر میں جنیوا کنونشن اور ان کے ساتھ اضافی پروٹوکول اس قسم کے معاہدات کی مثالیں ہیں۔ شریعت نے مسلمانوں پر لازم کیا ہے کہ جنگ کے دوران بعض قواعد اور ضوابط کا لحاظ رکھیں گے قطع نظر اس سے کہ دوسرا فریق ان کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسرا فریق ان قواعد کو معاہدے کا حصہ بنا کر ان کی پابندی پر آمادہ ہو تو مسلمانوں کے لیے اس قسم کے معاہدات میں شامل ہونا مستحسن ہی ہو گا۔ اس قسم کے معاہدات کے تحت ممنوع کام اس وقت تک ممنوع رہیں گے جب تک وہ معاہدات مؤثر ہوں۔ الا یہ کہ ان کاموں کو شریعت نے بھی ممنوع قرار دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے تحت ممنوع شدہ کام مسلمانوں کے لیے ممنوع رہیں گے خواہ دوسرے فریق کے ساتھ معاہدہ ختم ہو جائے۔ اس قسم کے معاہدات سے بعض مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جنگی قیدیوں کے متعلق نص قرآنی کے بموجب مسلمان حکمران کو دو اختیار دیے گئے ہیں؛ من اور فداء، یعنی بغیر معاضہ کے یا معاوضہ لے کر رہائی۔ [2] چوتھے جنیوا معاہدے کے ذریعے طے کیا گیا ہے کہ جنگ کے خاتمے پر قیدیوں کو بغیر معاوضہ کے رہا کیا جائے گا۔ [3] کیا یہ شق شریعت کے خلاف تصور کی جائے گی یا اسے حکمران کے اختیارات کا جائز استعمال سمجھا جائے گا؟ عصر حاضر میں آداب القتال کے

۱۔ (مثال کے طور پر امام محمد بن الحسن الشیبانی نے امام ابو حنیفہ کا یہ اصول نقل کیا ہے کہ باغیوں کے سر کاٹ کر شہروں میں نہ پھرائے جائیں خواہ مخالفین ایسا کریں۔ اس اصول کی ایک وجہ سرخسی نے یہی بیان کی ہے مسلمانوں کو مثلۃ کے ارتکاب سے رسول اللہ ﷺ نے روکا ہے۔ لانہ مثلۃ، والمثلۃ حرام۔ وقد نھی رسول اللہ ﷺ عن المثلۃ ولو بالکلب العقور۔ ولانہ لم یبلغنا ان علی رضی اللہ عنہ صنع ذلک فی شیء من حروبہ، وھو المتبع فی الباب۔ ولما حمل رأس یباب البطریق الی ابی بکر رضی اللہ عنہ۔ فقیل لہ ان الفرس والروم یفعلون ذلک۔ فقال لسنا من الفرس ولا الروم، "یکفینا الکتاب والخبر"۔ (کیونکہ یہ مثلہ ہے، اور مثلہ حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے باؤلے کتے کے مثلے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایسی کوئی روایت نہیں ملی کہ انہوں نے اپنی جنگوں میں ایسا کبھی کیا ہو، اور اس باب کے احکام کے لیے ماخذ انہی کا طرز عمل ہے۔ اسی طرح جب باب بطریق کا سر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا۔ جب کہا گیا کہ اہل روم و فارس ایسا کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہم نہ اہل روم ہیں اور نہ اہل فارس، ہمارے لیے کتاب اور سنت ہی کافی ہے۔) المبسوط،، ص:۱۰/۱۳۸

۲۔ محمد:۴۷/۴

۳۔ تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ ۱۱۸ میں قرار دیا گیا ہے کہ "جیسے ہی جنگ کا خاتمہ ہو" ہو دونوں فریق جنگی قیدیوں کو رہا کریں گے۔ اس معاہدے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ "جنگ کا خاتمہ" کب ہو گا؟ مثلاً امریکہ نے اپریل ۲۰۰۳ء میں عراق پر قبضہ کیا ہے مگر ابھی تک وہ خود کو جنگی قیدیوں کے رہا کرنے کے پابند نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ امریکی قانون کے تحت امریکی صدر ہی اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ وہ جنگ کے شروع ہونے اور اس کے ختم ہونے کا اعلان کرے، اور ابھی امریکی صدر نے جنگ کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا!

حوالے سے تین امور نہایت اہمیت اختیار کر گئے ہیں: غیر مقاتلین کا تعین، بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے استعمال کا حکم اور جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک۔

۱۔ غیر مقاتلین کو نشانہ بنانے کی ممانعت:

مسلمان اہل علم کا اس بات پر اصولاً اتفاق ہے کہ غیر مقاتلین کو جنگ میں نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر غیر مقاتلین جنگ میں حصہ لیں تو ان کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔[۱] لیکن چند امور ایسے ہیں جن پر اختلاف پایا جاتا ہے اور جو مزید غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ اولاً غیر مقاتلین میں کون لوگ شامل ہیں؟ خواتین اور بچوں کو بالعموم غیر مقاتلین میں شامل کیا جاتا ہے، لیکن وہ جوان مرد جو فوج کا حصہ نہ ہوں کیا ان کو بھی غیر مقاتل کہا جائے گا؟ پرانے زمانے میں جوان مرد کو بالفعل یا بالقوۃ جنگجو سمجھا جاتا تھا اور عورتوں کو اصولاً غیر مقاتل ہی سمجھا جاتا تھا لیکن کیا یہ بات عصر حاضر کے تناظر میں بھی صحیح ہے؟ کیا موجودہ حالات میں "غیر فوجی" کو ہی غیر مقاتل سمجھا جائے گا؟ بہت سے اہل علم نے شہری (Civilian) اور غیر مقاتل کو مترادف مانا ہے۔[۲] لیکن ایک رائے یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ چونکہ شہریوں کے ٹیکسوں سے فوج کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں اس لیے بالواسطہ ہی سہی شہری بھی جنگ میں حصہ لیتے ہیں اس لیے ہر ٹیکس دینے والا مقاتل تصور ہو گا۔[۳] اسی طرح اگر کسی ملک میں تمام شہریوں کے لیے فوجی تربیت لازمی ہو تو وہاں مقاتل اور غیر مقاتل میں تمیز کیسے کی جائے گی؟

۲۔ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار:

اگر تمام غیر فوجیوں کو غیر مقاتل کہا جائے تو پھر بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا استعمال بھی اصولاً ناجائز ہو گا کیونکہ ان کا اثر صرف فوجی تنصیبات تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ ان کا استعمال صرف معاملہ بالمثل اور اضطرار کی صورت میں ہی جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا معاملہ بالمثل اور اضطرار کی بنیاد پر ایٹمی ہتھیار اور زہریلی اور کیمیاوی گیسوں کا استعمال جائز ہو سکتا ہے؟ ان ہتھیاروں کے اثرات تو بہت ہی تباہ کن اور کئی نسلوں پر محیط ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی عدالت انصاف نے اپنے مشہور (لیکن متنازعہ!) فیصلے میں اصولاً ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کو ناجائز قرار دیا لیکن اس مسئلے پر ججوں کا اختلاف ہوا کہ کیا کوئی اضطرار کی حالت ایسی ہو سکتی ہے جس میں ریاست کی بقا ہی خطرے میں پڑ جائے اور اس

۱۔ المغنی، ص:۸/۴۷۷

۲۔ محمد منیر، احکام المدنیین فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الدولی الاسلامی / دراسۃ مقارنۃ، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایل ایل ایم شریعہ و قانون، کلیۂ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۶ء)، ص:۴۸

۳۔ یہ رائے اسامہ بن لادن نے ایک انٹرویو میں پیش کی۔ یہ انٹرویو مشہور صحافی حامد میر نے مبینہ طور پر افغانستان پر امریکی حملے کے دوران میں لیا تھا۔ اور روزنامہ ''اوصاف'' اسلام آباد اور انگریزی روزنامہ ''ڈان'' اسلام آباد میں ایک ہی روز (نومبر ۲۰۰۱ء) شائع ہوا تھا۔

کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہو کہ وہ ایٹمی ہتھیار استعمال کرے؟ بعض ججوں کی رائے یہ تھی کہ ایسی کوئی اضطراری حالت بھی ان ہتھیاروں کے استعمال کو جواز نہیں عطا کر سکتی لیکن بعض دیگر ججوں کی رائے یہ تھی کہ ایسی صورت میں ان ہتھیاروں کے استعمال کی ممانعت کے لیے بین الاقوامی قانون میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔[۱]

۳۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک :

آداب القتال کے حوالے سے ایک اور اہم بحث جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کا معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا غیر مقاتلین کو جنگی قیدی بنایا جاسکتا ہے؟ فقہا نے جنگی قیدیوں میں مقاتلین کو "اسریٰ" اور غیر مقاتلین کو "سبی" کا نام دیا تھا۔[۲] کیا اس تقسیم کو اب بھی برقرار رکھا جاسکتا ہے؟[۳] دوسرا سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کے تحت مطالبات منوانے کے لیے جنگی قیدیوں کو یرغمال بنانے کی ممانعت ہے اور اسے دہشت گردی میں شمار کیا جاتا ہے۔[۴] کیا اسلامی قانون کے تحت جنگی قیدیوں کو یرغمال رکھنا جائز ہے؟ تیسرا سوال قیدیوں کی رہائی سے متعلق ہے۔ قرآن کریم نے نص صریح کے ذریعے ان کے متعلق دو آپشن دیے ہیں؛ من یا فداء۔ پھر فقہاء نے کس بنیاد پر دیگر آپشن (غلام بنانا اور قتل کرنا) ذکر کیے؟ اگر ان کا استدلال رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل سے تھا تو رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کی بنیاد کیا تھی؟ ایک رائے یہ پیش کی گئی کہ قرآنی نص نے دو اختیارات ذکر کیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکمران کو دیگر اختیارات حاصل نہیں ہیں۔[۵] لیکن یہ رائے اس لیے قوی نہیں لگتی کہ آیت کریمہ میں 'اما منا بعد واما فداء' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جو بظاہر حصر کو مستلزم ہے۔[۶] اس لیے کچھ بے باک لوگوں نے سرے سے اس کا ہی انکار کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی قیدیوں کو غلام بھی بنایا تھا یا قتل بھی کیا تھا۔ انہوں نے اس قسم کی ساری روایات کو "عجمی سازش" کہہ کر مسترد کر دیا۔[۷] ایک رائے یہ پیش کی گئی کہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۵ میں مخالفین کو قتل کرنے اور گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے اس آیت نے سورۃ محمد کی آیت کو منسوخ کر دیا۔[۸] لیکن نسخ یہاں صریح نہیں بلکہ آیات کے درمیان ظاہری تعارض کی وجہ سے فرض کیا گیا ہے کہ ایک آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ گویا یہ نسخ ضمنی

---

1. Advisory Opinion on the Legality of the Use of Nuclear Weapons (WHO Case), ICJ 1996 Rep 66.

۲۔ المبسوط، ص:۱۰/۶۰

۳۔ بین الاقوامی قانون کے تحت شہریوں اور غیر مقاتلین کو Internees کے طور پر پابند کیا جاسکتا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے: چوتھے جنیوا معاہدات کی دفعات ۴۱۔۴۳ اور ۶۸ و ۷۸۔۱۳۵)

۴۔ چاروں جنیوا معاہدات کی مشترک دفعہ ۳/ چوتھے جنیوا معاہدے کی دفعہ ۳۴ اور ۱۴۷/ پہلے اضافی پروٹوکول کی دفعہ ۷۵

۵۔ مودودی، تفہیم القرآن، ص:۵/۱۱-۱۸

۶۔ رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، (دمشق: المطبعۃ الخیریۃ، ۱۹۶۷ء)، ص:۷/۳۶۳

۷۔ غلام احمد پرویز، غلام اور لونڈیاں، (لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ، ۱۹۸۴ء)

۸۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر، (القاہرۃ: دار الکتب العربیۃ، ۱۹۸۴ء)، ص:۲/۱۶۹

ہے اور نسخ ضمنی کی طرف تبھی جایا جاتا ہے جب دو نصوص کے درمیان جمع و تطبیق ممکن نہ ہو۔[1] یہاں تطبیق بلا تکلف ممکن ہے۔ سورۃ التوبۃ کی آیت جنگ کے دوران حملے کے لیے حکم متعین کرتی ہے، جبکہ سورۃ محمد کی آیت جنگ کے خاتمے پر جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کے متعلق حکم دیتی ہے۔[2] جناب جاوید احمد غامدی کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ طرز عمل سورۃ محمد کی آیت کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ عام طور پر آپ قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کرتے تھے اور اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ کبھی آپ قیدیوں کا تبادلہ کرتے یا کسی اور عوض پر انہیں رہا کر دیتے۔ جیسے بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو صحابہ نے تقسیم کے بعد از خود آزاد کیا کیونکہ آپ ﷺ نے اس قبیلے کی ایک خاتون (سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا) سے شادی کی۔ کبھی ایسا ہوا کہ اگر کچھ صحابہ قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ نہ تھے تو انہیں معاوضہ دے کر قیدیوں کو رہا یا کروایا۔[3] یہ ساری باتیں صحیح ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب آپ نے ایک بار قیدیوں کو تقسیم کیا تو کیا ان کو غلام نہیں بنایا گیا اور کیا صحابہ کو ان پر مالکانہ حقوق نہیں دیے گئے؟ اگر وہ غلام نہیں بنائے گئے تو بعض صحابہ کو معاوضہ کس چیز کا دیا گیا؟ ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی مانتے ہیں کہ بعض مواقع پر قیدیوں کو غلام بنایا گیا مگر وہ اسے معاملہ بالمثل قرار دیتے ہیں۔[4] لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا معاملہ بالمثل کی بنیاد پر قرآنی نص پر اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح بنو قریظہ کے مقاتلین کو آپ ﷺ نے قتل کر دیا اور غیر مقاتلین کو غلام بنایا۔ عصر حاضر کے اکثر مسلمان اہل علم اسے اس بنیاد پر جواز عطا کرتے ہیں کہ ایک تو یہ ثالث کا فیصلہ تھا اور ثالث بھی یہود نے ہی مقرر کیا تھا۔ دوسرے یہ تورات کا ہی فیصلہ تھا جو ان پر نافذ ہوا۔[5]

خلاصہ بحث:

اس باب میں غزوات و سرایا سے اخذ کردہ جنگی اصول و قواعد کو بیان کیا گیا ہے۔ فصل میں ان جنگی اصول و قواعد کو بیان کیا گیا ہے دوران جنگ جن کے کرنے کا حضور ﷺ نے حکم دیا ہے۔ اور فصل دوم میں ان جنگی اصول و قواعد کو بیان کیا گیا ہے جن کے کرنے سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے ہر ایک عنوان کے آخر میں تجزیہ بھی کیا گیا ہے، اس میں ہر ایک جنگی اصول سے ہمیں جو بھی سبق حاصل ہوتا ہے اس کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور عصر حاضر میں فریضۂ جہاد کی نوعیت اور ان جنگی اصول و قواعد سے کیسے استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے کی چند ایک صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، (کراچی: دار الاشاعت، ۱۹۸۶ء)، ص:۲/۲۱-۲۲

۲۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان، (القاہرۃ: دار الفکر، ۱۹۶۶ء)، ص:۲۶/۲۴

۳۔ غامدی، قانون جہاد، ص:۲-۲۷۶-۲۷۷

۴۔ زحیلی، آثار الحرب، ص:۲-۴۴۲-۴۴۵

۵۔ ایضاً، ص:۴۳۶

خلاصہ تحقیق

فقہ کا دوسرا بڑا ماخذ سیرت طیبہ ہے اور سیرت سے فقہی احکام و مسائل کے استنباط کو فقہ السیرۃ کہتے ہیں۔ متقدمین کے ہاں سیرت میں صرف غزوات و سرایا شامل تھے۔ جب کہ متاخرین نے سیرت کے تحت حضور ﷺ کی عبادات، اخلاق وعادات اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی سیرت میں شامل کیا ہے۔ فقہ السیرۃ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب کا ایک ضخیم ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن اس تحقیقی مقالہ میں برصغیر میں فقہ السیرۃ پر لکھی جانے والی مولانا عبدالرؤف داناپوری کی "اصح السیر" کے غزوات وسرایا کی فقہی مباحث کا اختصاصی مطالعہ کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالرؤف داناپوری ۱۸۵۶ء میں داناپور میں پیدا ہوئے آپ کو علم سے گہرا شغف تھا آپ کے والد محترم چونکہ ایک بلند پایۂ عالم دین تھے اس لئے آپ کو شروع سے ہی دینی اور علمی ماحول ملا۔ آپ کی پوری زندگی علم کے حصول اوراشاعت میں گزری۔ آپ بیک وقت ایک جید عالم دین ایک ماہر طبیب اور ایک کہنہ مشق سیاستدان تھے۔ آپ ۱۹۴۸ء میں اس دنیافانی سے رخصت ہوئے۔ آپ نے طب میں بہت سی تصانیف لکھی ہیں۔ لیکن آپ کی سیرت طیبہ پر لکھی گئی تصنیف "اصح السیر" کا درجہ آپ کی باقی تمام تصانیف سے اونچا اوراعلیٰ ہے۔ آپ کا اس کتاب کو لکھنے کا مقصد سیرت کو اس کے مستند اور معتبر مصادر سے اکٹھا کرنا اور سیرت طیبہ سے فقہی مسائل واحکام کا استنباط کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اس کتاب کا اسلوب خالصتاً فقہی ہے۔ سیرت کے واقعات سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط انتہائی آسان، دلچسپ اور مفید انداز میں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن وحدیث تعامل صحابہ اور اقوال اسلاف سے استدلال کیا گیا ہے۔ ائمہ اربعہ کی آراء واختلافات کے بیان، دیگر فقہاء و علماء کے اقوال سے استدلال اور فقہی اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے مباحث فقہیہ کو پر اثر بنایا گیا ہے۔ دیگر وقائع سیرت اور دور نبوی ﷺ کے بعد کی اسلامی تاریخ کے واقعات سے بھی استشہاد کیا گیا ہے۔ ناسخ و منسوخ کی نشاندہی متعارض روایات میں تطبیق اور قارئین کے لیے غریب فقہی اصطلاحات کی تشریح وتوضیح اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اس مقالہ میں "غزوات و سرایا میں مباحث فقہیہ: اصح السیر کا اختصاصی مطالعہ" پر کام کیا گیا ہے جو اس مقالہ کی تالیف کا اصل جز ہے۔ کیونکہ اصح السیر فقہی انداز پر لکھی گئی ہے اس لئے اس میں مباحث فقہیہ کا اہتمام زیادہ کیا گیا ہے۔ اصح السیر میں فقہی مباحث کے بیان میں قرآن سے استدلال کرنے کا اسلوب مفصل اور سیر حاصل ہے اور اس میں حدیث کے ضعف اور رواۃ پر جرح وتعدیل کی نشاندہی کا اہتمام زیادہ تر فقہی مباحث میں کیا گیا ہے۔ اصح السیر میں تعامل صحابہ و تابعین سے استدلال کا ہر جگہ ایک ہی طریقہ اپنایا گیا ہے۔ باوجود حنفی ہونے کے ترجیح ورد کے سلسلے میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ ناسخ و منسوخ کی نشاندہی میں جامع اور تفصیلی اندازاپنایا گیا ہے۔ استنباط احکام کے ضمن میں لغوی تشریح و توضیح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ ایک نمایاں خصوصیت تو یہ ہے کہ اصح السیر میں فقہی مباحث کے بیان میں فقہی اصول و

ضوابط کا اطلاق کیا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ سیرت کے دیگر واقعات اور آپ ﷺ کے دور کے بعد کی اسلامی تاریخ سے بھی استشہاد کیا گیا ہے۔

اس مقالہ کو ابواب و فصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تاکہ موضوع کا کوئی پہلو باقی نہ رہ جائے اور موضوع کے ہر پہلو پر تفصیلات مہیا کی جائیں۔ باب اول کو تین فصول میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلی فصل میں فقہ السیرۃ، غزوات و سرایا کے تعارف کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے، دوسری فصل میں مؤلف اور کتاب کے تعارف کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے اور تیسری فصل میں کتاب کا اسلوب و منہج اور خصوصیات کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں غزوات و سرایا میں مباحث فقہیہ سے اخذ شدہ احکام و مسائل کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے یہ باب بھی تین فصول پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں شہداء کی تجہیز و تکفین کے متعلق مسائل کو بیان کیا گیا ہے، دوسری فصل میں احکام زکوٰۃ، احکام جزیہ اور مال غنیمت کی تقسیم کے طریقہ کار کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے اور تیسری فصل میں متفرق مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اور تیسرے باب کو دو فصول میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلی فصل میں غزوات و سرایا سے حاصل ہونے والے جنگی اصول و قوائد اور جنگی اصلاحات کو بیان کیا گیا ہے اور دوسری فصل میں غزوات و سرایا سے حاصل ہونے والے ثمرات و نتائج اور عصر حاضر میں ان سے استفادہ کو بیان کیا گیا ہے اور مقالہ کے آخر میں نتائج اور سفارشات کو بیان کیا گیا ہے۔

نتائج

اصح السیر کے مطالعہ سے درج ذیل نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

- مصنف کتاب نے واقعات سیرت کو صحیح روایات سے بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔
- مصنف کتاب نے غزوات و سرایا کے تحت فقہی مباحث کے لیے با قاعدہ ابواب مرتب کیے ہیں۔
- اصح السیر میں مصنف نے احادیث کو کثرت سے ذکر کیا ہے اور روایت کی صحت کا بھی کافی اہتمام کیا ہے۔
- کسی واقعۂ سیرت سے اگر کسی فقہی مسئلہ کا پتہ چلتا ہو تو با قاعدہ اسکا استنباط کرتے ہیں اور ائمہ اربعہ کی آراء واختلاف بھی درج کرتے ہیں۔ اور اگر کسی اختلافی مسئلے میں تطبیق ممکن ہو تو تطبیق دینے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔
- مصنف کتاب فقہی مباحث میں اپنی رائے بھی بیان کرتے ہیں اور اکثر دلیل کے طور پر حدیث یا کسی امام کے قول کا ذکر کرتے ہیں۔
- مصنف کتاب ترجیح اور رد کے سلسلے میں اعتدال سے کام لیتے ہیں۔
- کسی بحث سے اگر کوئی فقہی نکتہ اخذ ہو رہا ہو تو اس کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔
- کسی بحث میں کوئی شبہ پایا جا رہا ہو تو اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیتے ہیں۔
- فقہی مباحث سے کوئی نتیجہ نکل سکتا ہو تو نتیجہ بھی ذکر کر دیتے ہیں۔
- مصنف کتاب نے غزوات و سرایا کی بحث کے ضمن میں جنگی اصول و قواعد کو بھی ذکر کیا ہے۔

سفارشات

محققین کے لیے:

- فقہا کے وضع کردہ جہاد کے نظریے کا موازنہ عصر حاضر کے بین الاقوامی قانون کے پورے نظام کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔
- برصغیر اور عرب میں فقہ السیرۃ کے اسالیب میں فرق پر کام ہونا چاہیے۔
- برصغیر میں فقہ السیرۃ پر کئے گئے کام کا تحقیقی جائزہ لینا چاہیے۔

حکومت وقت کے لیے:

- حکومت کو چاہیے کہ سکول و کالج کے اسلامیات کے سلیبس میں ایک حصہ فقہ السیرۃ کے حوالے سے شامل کرے۔
- سکول، کالج اور یونیورسٹی سطح پر ایسے سیمینار منعقد ہونے چاہییں جن سے نوجوانوں میں سیرت کے اس نئے رجحان "فقہ السیرۃ" کا شعور پیدا ہو جائے۔

عسکری اداروں کے لیے:

- حکومت کو چاہیے کہ فوج کی ٹریننگ میں ہی ہر فوجی کے لیے حضور ﷺ کے غزوات و سرایا اور ان سے متعلق فقہی احکام و مسائل پر آگاہی کو ضروری قرار دے۔
- فوج میں موجود خطباء حضرات کو چاہیے کہ اپنے خطبہ اور درس میں جہاد کے متعلق احکام و مسائل اور فضائل کو حضور نبیٔ کریم ﷺ کے غزوات و سرایا کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ بیان کریں۔

فہرست آیات

نمبر شمار	آیت	سورة	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱.	وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ	البقرة	۴۳	۸۴
۲.	وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا	〃	۱۹۰	۱۳۴
۳.	وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ ...	〃	۱۹۳	۱۳
۴.	وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ ...	〃	۲۰۵	۱۳۸
۵.	لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ ...	آل عمران	۱۲۸	۱۰۲
۶.	يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا ...	〃	۱۵۶	۱۴
۷.	الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ ...	النساء	۷۶	۱۳
۸.	يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا ...	〃	۹۴	۱۴۰
۹.	وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم	المائدة	۶	۱۰۵
۱۰.	وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ	الانفال	۴۱	۹۱،۹۴
۱۱.	وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ ...	〃	۶۱	۱۳
۱۲.	وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ...	〃	۴۶	۱۲۸
۱۳.	وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوامِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ ...	〃	۴۷	۱۳۰
۱۴.	لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ ...	التوبہ	۲۵	۱۲۹
۱۵.	لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ	〃	۱۲۲	۲
۱۶.	قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى	طٰہ	۲۱	۳
۱۷.	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ	الانبياء	۱۰۷	Xi
۱۸.	أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى ...	الحج	۳۹	۱۲
۱۹.	فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّى إِذَا ...	محمد	۴	۱۳۹
۲۰.	مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى...	الحشر	۵	۱۳۸
۲۱.	وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَل...	〃	۶	۹۵
۲۲.	اِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ ...	الصف	۴	۱۳۲

فہرست احادیث

نمبر شمار	حدیث	مصدر	صفحہ نمبر
۱.	ابْنُ عَبَّاسٍ وَابْنُ الزُّبَيْرِ اخْتَلَفَا فِي الْمُتْعَتَيْنِ فَقَالَ جَابِرٌ فَعَلْنَاهُمَا ...	صحیح مسلم	۱۱۵
۲.	أُتِيَ بِهِمْ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ أُحُدٍ، فَجَعَلَ ...	سنن ابن ماجہ	۷۹
۳.	ادْعُهُمْ إِلَى:شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ،فَإِنْ هُمْ ...	صحیح بخاری	۸۴
۴.	أَشْهَدُ أَنِّي سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُولُ: إِنَّ الْقُنُوتَ فِي صَلَاةِ الصُّبْحِ ...	سنن الدار قطنی	۱۰۴
۵.	اغْزُوا بِاسْمِ اللّٰهِ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَقَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ اغْزُوا وَلَا ...	سنن ابوداؤد	۱۳۷
۶.	أَلَا «إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَرْجِعُوا بِالْقَتْلَى، ...	مسند أحمد	۸۲
۷.	إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمُتْعَةِ وَعَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ ...	صحیح بخاری	۱۱۳
۸.	أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:قَنَتَ بَعْدَ الرَّكْعَةِ، فِي صَلَاةٍ ...	صحیح مسلم	۱۰۲
۹.	أَنَّ امْرَأَةً وُجِدَتْ فِي بَعْضِ مَغَازِي النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ...	صحیح بخاری	۱۳۶
۱۰.	أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ ...	؍	۷۹
۱۱.	أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ظَهَرَ عَلَى خَيْبَرَ،قَسَمَهَا ...	سنن أبوداؤد	۱۱۶
۱۲.	أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ ...	صحیح بخاری	۱۱۲
۱۳.	إنَّ صاحِبَكُم تَغسِلُه المَلائكَةُ، فاسأَلوا صاحِبَتَه". فقالَت: خَرَجَ ...	سنن الکبری	۷۷
۱۴.	أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَجْلَى الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى ...	صحیح بخاری	۱۱۰
۱۵.	أَنَّ نَاسًا مِنْ عُكْلٍ وَعُرَيْنَةَ، قَدِمُوا الْمَدِينَةَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ ...	؍	۱۰۸
۱۶.	الْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ	؍	۱۱
۱۷.	إِنْ وَجَدْتُمْ فُلَانًا فَأَحْرِقُوهُ بِالنَّارِ، فَوَلَّيْتُ فَنَادَانِي فَرَجَعْتُ إِلَيْهِ ...	سنن ابی داؤد	۱۳۷
۱۸.	إِنَّمَا كَانَتْ رُخْصَةً فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ لِمَنِ اضْطُرَّ إِلَيْهَا.كَالْمَيْتَةِ ...	صحیح مسلم	۱۱۴
۱۹.	أَهْرِيقُوهَا وَاكْسِرُوهَا. فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَوْ نُهَرِيقُهَا ...	؍	۷۰
۲۰.	خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ، ...	صحیح بخاری	۱۰۶
۲۱.	صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم على قتلى أحد بعد ثماني ...	؍	۸۰
۲۲.	فَقَنَتَ شَهْرًا يَدْعُو عَلَى رِعْلٍ وَذَكْوَانَ وَبَنِي لِحْيَانَ	؍	۱۰۱
۲۳.	كُنَّا نَغْزُو مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وليس لنا شيء ...	؍	۱۱۴
۲۴.	لاَ يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ	صحیح مسلم	۱۲۰
۲۵.	اللَّهُمَّ اهدِنِي فيمَن هَدَيتَ، وعافِنِي فيمَن عافَيتَ، وتَوَلَّنِي فيمَن ...	سنن ابوداؤد	۱۰۴

۲۶.	اللَّهُمَّ فَقِّهُ فِي الدِّينِ، وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ	مسند احمد	۵
۲۷.	مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ خَالَفَ الجَمَاعَةَ...	″	۱۲۸
۲۸.	وَمَنْ يُرِدْ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ	صحیح مسلم	۲
۲۹.	يَقنُتُ فى صَلاةِ الغَداةِ حَتَّى فارَقَ الدُّنيا	سنن الدار قطنی	۱۰۴

مصادر ومراجع

- القرآن الکریم

کتب تفاسیر

- آلوسی ، محمود ، علامه، روح المعانی، دارالکتب العلمیة،(بیروت، لبنان)
- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي، (المتوفى: ۷۷۴ھ) تفسير القرآن العظيم ،الناشر: دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية ۱۴۲۰ھ – ۱۹۹۹ء-
- طبری، محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل القرآن (بیروت لبنان)
- مظهري، محمد ثناء الله، التفسير المظهري، مكتبة الرشدية، الباكستان، الطبعة: ۱۴۱۲ ھ

کتب احادیث

- ابن ماجة ،أبو عبد الله محمد بن يزيد القزوينی، سنن ابن ماجة، (دار الرسالة العالمية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٣٠ ھ، ۲۰۰۹ ء)
- ابو داؤد، سلیمان بن الاشعث، سنن ابو داؤد، (دار الرسالة العالمیة، الطبعة الأولى، ۱۴۳۰ھ، ۲۰۰۹ء)
- أحمد بن عبد الرحمن بن محمد ،مسند أحمد، لطبعة الثانية،(دار احياء التراث العربی، بيروت، لبنان)
- بخاری، محمد بن اسمعیل ابو عبد الله ، صحیح بخاری، دار ابن کثیر،(بیروت، الطبعة الثالثة، ۱۴۰۷ھ، ۱۹۸۷ء)
- بیهقی، احمد بن علی بن موسی ابو بکر البیهقی، سنن الکبریٰ ،مکتبة دار الباز، مکة المکرمة، ۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۴ء
- دارقطنی،علی بن عمر أبو الحسن ،سنن الدارقطنی، (دار المعرفة بيروت ، ۱۳۸۶ھ، ۱۹۶۶ء)
- الطحاوی أبو جعفر أحمد بن محمد، شرح معانی الآثار، (مكتبة ،عالم الكتب، الطبعة الأولى، ١٤١٤ھ ١٩٩٤ء)
- عسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، مقد مة فتح الباری شرح صحیح البخاری،(مکتبة السلفیة، القاهرة، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۵ء)
- قرطبی، أبو الحسن علی بن خلف بن عبد الملك بن بطال البكری، شرح صحیح بخاری لابن بطال، (مكتبة الرشد ، الرياض، السعودية، الطبعة الثانية ۱۴۲۳ھ، ۲۰۰۳ء)
- مسند احمد ،أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن حنبل، مؤسسة الرسالة،(الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۱ھ،۲۰۰۱ ء)

- مؤطا محمد،عبد الحئ اللكنوی ،امام الهمام ابئ الحسنات، المؤطا لامام محمد مع تعليق لمجد، (مكتبة، الميزان ناشران وتاجران كتب، لاهور)
- مسلم،ابوالحسین مسلم بن الحجاج،القشیری،صحیح مسلم،(دار الجلیل، بیروت،لبنان)

عربی کتب

- ابن سعد، ابو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الزهری، الطبقات الکبری،(دار الکتب العلمية ،بیروت، الطبعة الاولی ۱۴۱۰ھ، ۱۹۹۰ء)
- ابن منظور، لسان العرب ، ابن منظور افریقی، (مکتبه دار صادر ،بیروت، لبنان، طبع اولیٰ ،۱۴۱۴ھ)
- راغب اصفهانی، أبو القاسم الحسين بن محمد، مفردات فی غریب القرآن،(دار القلم، الدار الشامية ، دمشق، بيروت، الطبعة الاولیٰ،۱۴۱۲ھ)
- علی محمد صلابی، سیرت النبی،(دار المعرفة للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، لبنان، الطبعة السابعة ۱۴۲۹ھ ، ۲۰۰۸ء)
- محمد بن أبی بکر ابن قيم الجوزية، زاد المعاد فی هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، (بيروت ،الطبعة السابعة والعشرون، ۱۴۱۵ھ، ۱۹۹۴ء)
- محمد سعيد رمضان البوطی،فقة السيرة النبوية،(الطبعة الاولیٰ،۲۰۰۱، مكتبة دار الفكر المعاصر، بيروت لبنان)
- محمد علی، تھانوی، كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم،(مکتبة، بيروت،الطبعة الاولیٰ،۱۹۹۶ء)
- المرغینانی، علی بن أبی بکر بن عبد الجلیل الفرغانی المرغینانی، الهداية فی شرح بداية المبتدی، (دار احیاء التراث العربی،بیروت،لبنان)
- واقدی،کتاب المغازی، محمد بن عمر بن واقدی،(مکتبة دار الاعلمی، بيروت،الطبعة الثالثة، ۱۴۰۹، ۱۹۸۹ء)

اردو کتب

- اسرار الحق، حکیم محمد، تاریخ اطباء بہار، (پٹنہ، انڈیا)
- داناپوری، محمد ابوالبرکات، عبد الرؤف، قادری، اصح السیر فی ھدی خیر البشر، (طبع اولیٰ، ۱۹۸۷ء، مکتبہ، البشریٰ ویلفئیر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ، کراچی، پاکستان، ۱۴۳۶ھ، ۲۰۱۵ء)
- دہلوی، شاہ عبد العزیز، عجالۂ نافعہ، (طبع اولیٰ، ۱۲۵۵ھ، ۱۸۳۹ء مکتبہ، مصطفائی، کان پور، انڈیا)
- دہلوی، محمد عبد الحق، مدارج النبوت، (مکتبہ اشتیاق، لاہور، طبع، ۲۰۰۴ء)

- شبلی نعمانی، سیرت النبی، (مکتبہ مدینہ لاہور، طبع اولیٰ، ۱۴۰۸ھ)
- غازی، ڈاکٹر محمود احمد، محاضرات سیرت، (الفیصل ناشران اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷
- غلام سرور لاہوری، جامع اللغات،) طبع اولیٰ، ۱۸۹۰ء، مکتبہ، منشی نول کشور، لکھنؤ
- کاندھلوی، محمد ادریس، معارف القران، (مکتبہ، المعارف، دارالعلوم حسینیہ، شہدادپور، سندھ، ۱۴۲۲ھ)
- کاندھلوی، محمد ادریس، سیرت مصطفی، (مکتبہ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۹ء)
- محمد منیر، احکام المدنیین فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الدولی الاسلامی
- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القران، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، اپریل: ۲۰۰۴ء)
- ندوی، سید سلمان، یادرفتگاں، (مجلس نشریات اسلام، کراچی)

انگلش کتب

- Advisory Opinion on the Legality of the Use of Nuclear Weapons (WHO Case), ICJ 1996
- D. J. Harris, Cases and Materials on International Law, (London: Sweet & Maxwell, ء1991)
- Muhammad Hamidullah, The Muslim Conduct of State , Sh. M. Ashraf, 1961
- Thomas M. Franck, When, If Ever, States May Use Force without Prior Security Council Authorization? SJICL (2000), 4, 371-76; N. W.

مقالہ جات

- فکر و نظر، ادارہ تحقیات اسلامی، اسلام آباد
- معارفِ اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد